بیعت، مجاہدات، ذکر واذکار واشغال کی شرعی حیثیت

احسان، تزکیہ اور تصوف

کیا ہے؟

حقیقت، اہمیت، ضرورت اور اشکالات

مفتی محمد ابو بکر جابر قاسمی

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين ,والعاقبة للمتقين ,ولا عدوان إلا على الظالمين ,والصلاة والسلام على خاتم الأنبياء والمرسلين محمد سيد بني آدم أجمعين .وآله الطاهرين ,وصحابته ,ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

عرض مرتب

یہ کتاب جناب مفتی محمد ابو بکر جابر قاسمی صاحب اور جناب مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی صاحب کی تصنیف کا ایک حصہ ہے۔ جسمیں احسان، تزکیہ، (تصوف) اور اس سے جڑے اصطلاحات جیسے بیعت، مجاہدات، نسبت، اذکار واشغال کی شرعی حیثیت پر قران حدیث اور علمائے اہل سنت والجماعت کے اقوال کی روشنی میں ایک محققانہ اور علمی بحث کی گئی ہے

سنجیدہ علمی کتاب

قابل قدر مصنف نے ایک ایسے موضوع پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے جس پر کچھ مسلمانوں کو اشکالات ہیں ۔ مصنف نے اس سلسلے کی کئی کتابوں اور تصوف پر ہو رہے موجودہ بحث و مباحثہ اور اسکے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے۔ جس سے یہ کتاب ایک طرح سے کئی کتابوں کا خلاصہ بن گیا ہے۔۔ اصل میں آجکل اختلافی موضوع پر کتابیں بہت آرہی ہیں لیکن کسی گروہ بندی سے بچ کر سنجیدہ علمی بات کرنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ اللہ مصنف کو جزائے خیر دے۔

احسان تزکیہ اور تصوف کے الفاظ

تصوف صوفیہ اور صوفی کا لفظ آج کل مسلمانوں کی انٹرنیٹ پر ہو رہی بحثوں میں بہت کثرت سے آرہا ہے۔ تصوف کا لفظ قرآن ااور حدیث کا لفظ نہیں ہے بلکہ قرآن اور حدیث میں اس کے لئے احسان اور تزکیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن لفظِ تصوف مشہور ہو گیا ہے۔

ایسا دین کے دوسرے اصطلاحات کے ساتھ بھی ہوا ہے

مثال کے طور پر عقیدہ کا لفظ جس معنٰی میں مسلمان استعمال کرتے ہیں قرآن اور حدیث میں عقیدہ لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ قرآن اور حدیث میں ایمان کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ بخاری شریف کی مشہور حدیث جبرئیل میں ہے۔

عقیدہ کا لفظ قرآن میں سور مائدہ آیت نمبر 89 میں ہے لیکمن وہ قسم کے مستحکم کرنے کے بارے میں استعمال ہوا ہے (تفسیر ابن کثیر)۔ لیکن ایمان سے زیادہ عقیدہ لفظ مشہور ہو گیا ہے۔ اسی طرح احسان اور تزکیہ سے زیادہ لفظ تصوف مشہور ہو گیا ہے۔

تصوف کی حمایت اور مخالفت

انٹر نیٹ پر تصوف کے موضوع پر اکثر اہل علم اسے بہت اچھی چیز مانتے ہیں لیکن بعض دوسرے لوگ اس لفظ کو بمنزلہ شرک اور کفر کے مترادف سمجھتے ہیں۔

تصوف کی مخالفت والے بعض مشتشد دلوگ تو تصوف کو حرام تک قرار دے رہے ہیں اور بعض تو کفر اور شرک تک بتا رہے ہیں جیسے اگر انہیں کسی عالم یا کسی جماعت کی برائی بیان کرنا ہو گا اور بتانا ہو گا کہ وہ بدعت اور شرک میں مبتلا ہیں تو اس کے لئے وہ کہ دینگے کہ فلاں جماعت یا عالم صوفی ہے۔ اگر انہیں آپ کو گالی دینا ہو گا تو بس اتنا کہ دیں گے تم صوفی ہو۔ اور آج کے انٹر نیٹ کے زمانے میں پورے زور شور سے اس کا پروپیگنڈہ کرہے ہیں۔ بحر حال اللہ ہی اس طرح کے نادان مسلمانوں کو سمجھا سکتا ہے۔ اللہ ان نادان مسلمانوں کو عقل سلیم عطا کرے اور سلف الصالحین کے طریقے پر چلنے کی توفیق عطا کرے

اللہ کی ذات سے امید ہے ہ یہ کتاب عام مسلمانوں کو شکوک وشبہات سے نکال کر اللہ اور اسکے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر جمائے گا۔ امید ہے کہ مسلمانان عالم اپنا وقت اور صلاحیت فتنہ انگیزی اور خلفشار سے بچا کر دین کی دعوت انسانیت کی فکر اس کی بھلائی اور دین کے دوسرے مثبت کاموں میں صرف کریں گے۔

اللہ تعالیٰ سے توفیق کا سوال ہے .

یہ کتاب

جناب مفتی محمد ابو بکر جابر قاسمی اور

جناب مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

کی تصنیف

تبلیغی جماعت اور کتب فضائل حقائق غلط فہمیاں

کا ایک چیپٹر ہے۔

جسے مکتبۃ الاتحاد دیوبند ضلع سہارنپور یوپی (انڈیا) 9897296985 نے شائع کیا ہے

جسے افادہ عام کی غرض سے الگ سے شائع کیا جارہا ہے۔

اللہ مصنف کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔



پوری کتاب نیچے کے لنک پر ڈاون لوڈ کر سکتے ہیں

https://nmusba.wordpress.com/2013/07/11/tableeghi-jamaat-kutub-fazail-haqaiq-galat-fehmiyaa-by-shaykh-mufti-abu-bakar-jaber-qasmi-and-shaykh-mufti-rafi-uddin-haneef-qasmi/

http://archive.org/download/TableeghiJamaatKutubEFazailHaqaiqGalatFehmiyaaComplete./Tableeghi%20Jamaat%20,%20Kutub%20e%20Fazail%20Haqaiq%20,%20Galat%20Fehmiyaa%20Complete..pdf

تصوّف کیا ہے؟

فضائل اعمال میں صوفیاءِ شرع اصطلاحاتِ تصوف، وسائل تصوف، ابن عربی وغیرہ کا جابجاذ کر آیا ہے، اس لیے ہمارے نزدیک تصوف کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اصطلاحات ووسائل کی کیا حیثیت ہے؟ اور عالمی صوفیاء کا مسخ کردہ وہ تصوف وطریقت جوشریعت سے آزاد ہو، اس سے ہمارا اور مصنفِ فضائل اعمال کا کوئی تعلق نہیں، ان اہم اور ضروری امور پر با حوالہ گفتگو کی گئی ہے۔

تصوّف کیا ہے؟

تصوّف، حقیقت، اہمیت وضرورت

رسولِ اکرم ﷺ جس دین حق اور جس طور وطریقے کی دعوت دینے کیلئے مبعوث ہوئے تھے، اس کا کامل ومکمل ترین نمونہ خود آپ ﷺ کی ذات اقدس تھی، خود آپ کی ذات گویا دین اسلام کی جیتی جاگتی وہ چلتی پھرتی مکمل ومجسم تصویر تھی جس کو اپنا کر اللہ کی رضا وخوشنودی، رحمت ورأفت کا مستحق ہو یا سکتا تھا۔

آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ مندرجہ ذیل تین شعبے نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱۔ ایمان

ایمان یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، وحی ورسالت۔ قیامت۔ حشر ونشر اور جنت ودوزخ، جیسی غیبی حقیقتوں کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ نے جو خبریں دی ہیں اور جو کچھ بتلایا ہے، اس کو حق ماننا اور دل سے اس کی تصدیق کرنا یہ دین حق کا سب سے اہم شعبہ ہے اور پورے دین کی اساس وبنیاد ہے اور یہی شعبہ ہمارے علم عقائد کا موضوع ہے۔

۲۔ اعمالِ صالحہ

اعمالِ صالحہ یہاں اس سے ہماری مرادِ دین کا وہ تمام تر عملی حصہ ہے جو جوارح یعنی ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتا ہے، جس میں اسلامی عبادات اور دعوت وجہاد اور معاملات وآداب، معاشرت وغیرہ داخل ہیں یہ شعبہ گویا دین کا پورا قالب ہے اور یہی اسلام کا عملی نظام ہے اور ہمارے علم فقہ کا تعلق اسی شعبہ سے ہے۔

۳۔ روحانی وقلبی صفات وکیفیات اور تزکیہ اخلاق

جن لوگوں کی کتاب وسنت پر کچھ نظر ہے، وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح ایمانیات واعتقادات، عبادات اور آداب معاشرت ومعاملات کے ابواب میں اپنی تعلیم وہدایت اور عملی نمونہ سے امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔ اس طرح آپ نے اللہ تعالیٰ کی محبت وخشیت، یقین وتوکل، احسان واخلاص جیسی روحانی وقلبی صفات وکیفیات اور تزکیۂ اخلاق کے متعلق بھی اہم

ہدایات دی ہیں اور ان کا نہایت اعلیٰ اور مثالی نمونہ اُمت کیلئے چھوڑا ہے، الغرض ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرح یہ بھی دین کا مستقل اور اہم شعبہ ہے اور یہی تصوف وسلوک کا خاص موضوع ہے ۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی تالیف تفہیماتِ الٰہیہ میں اس مذکورہ بالا شعبہ جات کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے :

ومعظم مادعت إلى اقامته الرسل أمور ثلثه: تصحيح العقائد فى المبدأ والمعاد والمجازاة وغيرها. وتصحيح العمل فى الطاعات المقربة والارتفاقات الضرورية على وفق السنة، وتصحيح الإخلاص والإحسان الذين هم اصلا الدينى الحنيفى ارتضاه الله بعباده.

جس چیز کے قیام واہتمام کی اللہ کے رسول نے دعوت دی ہے وہ بنیادی طور پر تین اُمور ہیں:

۱۔ عقائد کی تصحیح، خواہ ان کا تعلق مبدأ سے ہو یا معاد سے یا خبر جزاء وسزا وغیرہ سے۔

۲۔ اعمال کی تصحیح، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو، یا زندگی کے مسائل ومعاملات سے۔

۳۔ اخلاص واحسان کی تصحیح کہ یہ دونوں دین حنیف کی اصل بنیاد ہیں وہ دین حنیف جس کو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے منتخب اور پسند فرمایا ہے۔

پھر اس کی اہمیت وافادیت کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والذى نفسى بيده هذا الثالث أدقُّ المقاصد الشرعية مأخذًا وأعمقها محتدًا بالنسبة الى سائر الشرائع وبمنزلة الروح من الجسد و بمنزلة المعنى من اللفظ وتكفّل لها الصوفيه رضوان الله عليهم اجمعين، فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصوىٰ وحازوالسهم الأعلى. (۱/۱۳)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ تیسرا اَمر' مقاصد شرعیہ میں سے سب سے دقیق اور سب سے گہرا ہے، بہ نسبت دوسرے احکام کے، یہ ایسا ہے جیسے بدن کیلئے روح اور لفظ کیلئے معانی، اس اہم مقصد کا تکفل حضرات صوفیہ نے کیا، پس وہ خود راہ یاب ہوئے اور دوسروں کو بھی راہ پر لگایا خود سیراب ہوئے اور دوسروں کو بھی سیراب کیا اور انتہائی سعادت سے سرفراز اور مقصدِ اعلیٰ کے اوپر فائز المرام (مقصد کو پالینا) ہوئے۔

ایک جگہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے تصوف کی حقیقت یوں بیان کی ہے :

وہ ایسا علم ہے جس کے ذریعہ سے نفوس کا تزکیہ اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر وباطن کے احوال پہچانے جاتے ہیں، جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے غرض جس تصوف کے ہم قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں احسان کہتے ہیں یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے، یا تعمیر الظاہر والباطن (ظاہر وباطن کی دُرستگی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(۱)

ایک مرتبہ حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ نے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ سے دریافت کیا کہ ''یہ تصوف کیا بلا ہے؟''

انہوں نے یہ جواب دیا کہ ''تصوف کی حقیقت صرف تصحیح نیت ہے اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتداء " انما الاعمال بالنیات " سے ہوتی ہے اور انتہا "ان تعبد الله كأنك تراه" پر ہے اس کو یادداشت حضوری اور نسبت کہتے ہیں، میں نے کہا: مولانا سارے پاپڑ اسی کیلئے بیلے جاتے ہیں، اسی لئے ذکر وشغل ہوتا ہے، اسی کیلئے مجاھدے اور مراقبے ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا: جس کو اللہ جل شانہ اپنے لطف وکرم سے کسی بھی طرح سے یہ دولت عطا کردے اس کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو نبی ﷺ کی نظر کیمیا اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہو جاتے تھے، اس کے بعد اکابر اور حکماء امت نے قلبی امراض کے کثرت کی بنا پر مختلف علاج تجویز فرمائے جیسا کہ اطباء بدنی امراض کے علاج کیلئے مختلف نسخے تجویز کرتے ہیں۔(۲)

حضرت مولانا منظور صاحب نعمانیؒ تصوف کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

احسان وتصوف یہ دین کا ایک اہم شعبہ اور اس کا تکمیلی مرحلہ ہے، یہ وہ ہے جسے حدیث نبوی میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے ہمارے عرف میں تصوف بھی کہا جاتا ہے، جس کی حقیقت مختصر الفاظ میں یوں بیان کی جاسکتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بندہ کے قلب کو ایسا یقین واطمینان نصیب ہوجائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدہ سے ہوجایا کرتا ہے جس کے بعد کسی وہم اور وسوسے کی گنجائش نہیں رہتی، پھر جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ

(۱) اکابر کا سلوک واحسان : ۲۳ (۲) اکابر کا سلوک واحسان : ۳۱

عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہوجائے کہ جس کی وجہ سے دل ہمہ دم اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت سے معمور رہے۔(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا اقتباسات میں تصوف کی جو حقیقت اور اس کی تعریف اور مصداق کو بیان کیا گیا ہے یہ تو عین مطلوب شریعت ہے اور یہی کمالِ دین وایمان ہے، یہ دولت جس کو جس قدر نصیب ہوجائے کم ہے، غرض جس تصوف کے ہم قائل ہیں یہ وہی ہے جسے آیات واحادیث میں تزکیہ واحسان سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسے حضور ﷺ کے مقاصد بعثت اور ایمان کے تکمیلی شعبوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

تصوف وسلوک یا تزکیہ واحسان کا ثبوت قرآن وحدیث سے

مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوچکی کہ تصوف اور اس کے اعمال واشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات وملکات کی تحصیل ہے جن کو کتاب وسنت میں کمالِ ایمان واسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا، قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کیلئے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے مثلاً محبت کے بارے میں ارشادِ باری ہے :

○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲)

اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔

حدیثِ صحیح میں ہے :

○ "ثلث من كن فيه وجد حلاوة الايمان" (۳)

یعنی ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں ان میں سے اول یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو اور دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ کے واسطے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اس کیلئے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا۔

(۱) بخاری، باب حلاوۃ الایمان، حدیث : ۶۵۴۲ (۲) سورۂ بقرہ : ۱۶۵

○ سورۃ الانفال میں ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. (۱) سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے نور ایمان میں زیادتی ہو اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

○ اور سورہ مؤمنون میں اچھے اور کامیاب بندوں کے اوصاف میں یہ بھی آیا ہے : وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (۲) اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک اعمال کرتے وقت) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں لوٹ جانا ہے۔

○ اور سورۃ الزمر میں قرآن مجید کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ : تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (۳) اس سے ان لوگوں کے بدن کانپنے لگتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور پھر ان کا ظاہر وباطن نرم ہوکر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے۔

○ اور سورۃ آل عمران میں ہے : اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (۴) وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو (ہر وقت اور ہر حالت میں) یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔

○ اور سورۃ مزمل میں آپ ﷺ کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا گیا: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (۵) اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہوکے، اسی کی طرف متوجہ ہو۔

مذکورہ قرآنی آیات میں اہل ایمان کیلئے جن کیفیات واوصاف کا ہونا لازمی اور ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں :

○ ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت ہو۔

○ ان کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف ولرزش کی کیفیت پیدا ہوجائے۔

(۱) انفال: ۲ (۲) مؤمنون: ۶۰ (۳) زمر: ۲۳ (۴) آل عمران: ۱۹۱ (۵) مزمل: ۸

○ ان کے سامنے جب آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جائے جو ان کے نورِ ایمان میں اضافہ ہو۔

○ اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔

○ وہ ہر دم خوف سے ہیبت زدہ ہوں۔

○ اللہ کا خوف ان پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی ان کے دل ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابلِ قبول ہوگی یا نہیں۔

○ قرآن مجید کی تلاوت یا اس کی آیتیں سننے سے ان کے جسم کانپ جاتے ہوں اور ان کا ظاہر وباطن اللہ کی طرف اور اس کی یاد کی طرف جھک جاتا ہو۔

○ وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔

○ ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

احادیث میں تصوّف واحسان کا ذکر

قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال وکیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے :

○ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وأبغض لِلّٰہِ وَأَعْطٰی لِلّٰہِ وَ مَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانُ (۱)

جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کیلئے محبت کرے، (جس سے محبت رکھے) اور اللہ ہی کیلئے بغض رکھے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کیلئے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی رضا ہی کیلئے ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔

○ اِسی طرح حدیث مشہور حدیث جبرئیل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یوں بیان کی گئی ہے :

أن تعبد اللّٰه كأنّك تراه فان لم تكن تراه فإنه يراك (بخاری مسلم)
وفي رواية أن تخشى اللّٰه مكان ان تعبد اللّٰه (۲)

---

(۱) ابوداؤد: باب الدليل على زيادة الايمان، حديث : ۴۶۸۳

(۲) بخاری : باب سؤال جبريل النبی عن الايمان والاحسان وعلم الساعة، حديث : ۴۶۸۳

احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اسی طرح کرو (یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو) گویا تم اسکو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر چہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو پر وہ تم کو (ہر جگہ ہر آن) دیکھتا ہے۔

پہلی حدیث میں ''اخلاص'' کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں ''احسان'' کا اور یہ دونوں ان ہی احوال وکیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دُعاؤں میں تصوّف واحسان کا ذکر

دین میں ان احوال وکیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے حصول اور ان میں ترقی کیلئے دعائیں فرماتے تھے۔ چند دُعائیں بھی نقل کیے دیتے ہیں :

○ اللهم اجعل حبّك احب الىّ من نفسي واهلي ومن الماء البارد (۱)

اے اللہ! مجھے ایسا کردے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

اے اللہ! مجھے ایسا کردے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گویا ہر وقت مجھے دیکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جاملوں۔

○ اللّهم انّي اسئلك ايماناً يباشر قلبي ويقيناً صادقًا حتّى اعلم أنه لا يصيبني الّا ما كتبتَ لي ورضا من المعيشة بما قسّمت لي. (۲)

اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہو جائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقین اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئے گی جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے (یعنی یہ علم میرے دل کا حال بن جائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گذارہ تو نے میرے لئے مقدر کردیا ہے میں اس پر اپنے دل سے کی رضا تجھ سے چاہتا ہوں۔

○ اللّهمّ اجعل وساوس قلبي خشيتك وذكرك واجعل همّتي وهواي فيما تُحبّ وترضى.

---

(۱) كنز العمّال : الفصل السادس، فى جوامع الادعية، حديث : ۳۷۱۸

(۲) كنز العمّال : الفصل السادس، فى جوامع الادعية، حديث : ۳۶۵۷

اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت انہی چیزوں کی طرف ہو جو مجھے محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔

یہ سب دعائیں اور اس قسم کی اور بے شمار دعائیں کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں خود آپ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔

اِن دُعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ کا خوف، اللہ سے شوق ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات و خواہشات فراموش یا فنا ہو جائیں۔ عبادت میں آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقین صادق، رضا بالقضاء، توکل علی اللہ، حسن ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن اور مانوس ہونا اور اس کی عطا پر قانع ہونا، ذکر اللہ سے قلب کا اثر لینا، اس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا، اللہ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ کی یاد اور اس کا خوف، وساوس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے اور بندہ کا جی صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہیں، اس قسم کی کیفیات کا مطالبہ حضور نے اللہ عزوجل سے کیا ہے، ظاہر ہے ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے' نہ اعمال کے باب سے، بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

پس تصوف دراصل اسی قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہے اور اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبت شیخ اور کثرت ذکر و فکر) کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں۔

وسائل اور مقاصد کا فرق

تصوف کی حقیقت اور اس کی اہمیت کو سمجھنے میں جو چیز سب سے بڑی حائل اور رکاوٹ بنی ہے وہ وسائل اور مقاصد کے درمیان فرق کو نہ سمجھنا ہے۔ اس غلطی فہمی کا سبب جہاں وسائل اور مقاصد کی جداگانہ حیثیت اور مقام کو ملحوظ نہ رکھنا ہوا ہے وہیں کچھ جاہل اور کوتاہ بین صوفیاء نے جو دراصل اپنی اس تصوف کی دکان سے اپنی شہرت وعزت اور حلقہ احباب وارادت کے اضافہ کے خواہاں تھے بجائے مقاصد پر توجہ دینے کے وسائل کو اپنا مقصود اور مطمح نظر بنانے کی وجہ سے بھی تصوف کی حقیقت اور اہمیت پردۂ خفاء میں چلی گئی ہے اور اس کے تعلق سے بدگمانیاں اور غلط تصورات پیدا ہو گئے ہیں اس لئے ہم پہلے وسائل اور مقاصد کی حیثیت اور ان کا اپنا مقام بیان کرتے ہیں' جو لوگ تصوف کو کتاب وسنت کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس وقت یہ بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسری جگہوں پر یہ بات انہیں اچھی طرح یاد ہوتی ہے کہ شریعت نے ان چیزوں کو جو بطور مقصود اور مطلوب کے ہیں خود اسے اس نے متعین اور مشکل کر دیا ہے، البتہ ان مقاصد کے حصول کے ذرائع اور وسائل میں وسعت اور کشادگی کا راستہ اپنایا ہے' گرچہ بعض مواقع سے تو شریعت نے مقصد کے ساتھ حصول کا طریقہ بھی متعین کیا ہے جس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں، لیکن یہ شاذ ونادر ہی ہوا ہے' جیسے طہارت کیلئے پانی یا بوقت ضرورت مٹی کا استعمال یا نماز کے اعلان کیلئے اذان پکارنا کہ یہ ذرائع ہیں، لیکن چونکہ حصولِ مقصد کیلئے شریعت نے انہیں ذرائع کو متعین کر دیا ہے، اس لئے وضو کیلئے آدمی بجائے پانی کے کوئی اور سیال چیز استعمال کرے تو اس سے طہارت حاصل نہ ہوگی، اسی طرح نماز کی اطلاع کیلئے بجائے اذان کے اور کسی ذریعہ سے کام لیا جائے تو درست نہ ہوگا۔

لیکن زیادہ تر مواقع پر شریعت نے حصولِ مقصود کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا ہے، زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اس کے طریقۂ کار کے تعین کا اختیار اصحاب معاملہ کو دیا ہے، البتہ یہ حدود متعین کر دیئے کہ یہ ذرائع جواز کے درجے میں آتے ہوں خواہ وہ طریقہ عہد نبوت میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اس طریقے کو کتاب وسنت سے خارج نہیں کہا جا سکتا، مثلاً تحصیل علم مقاصد شرعیہ میں سے ایک عظیم مقصد ہے، لیکن اس کیلئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ منضبط نہیں کیا، آدمی کوئی بھی جائز طریقہ اختیار کرے جس سے علم حاصل ہو جائے درست ہے آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

زمانہ میں اس کیلئے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کیلئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا نہ مدرسے تھے۔ نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کیلئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی ضرورت درپیش ہو گئی اور اس کے بعد سے دین کے تعلّم اور تعلیم کا یہ سلسلہ چل پڑا، کیا حصولِ علم کے اس طریقۂ کار اور نظامِ عمل کو دین میں اضافہ یا بدعت قرار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں، کیونکہ یہ چیزیں وسائل کے قبیل سے ہیں اور وسائل میں شریعت نے توسع سے کام لیا ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت امت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا کہ فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتی کہ جب عہدِ صدیقی میں یمامہ کی جنگ میں چار سو حفاظِ قرآن صحابہ شہید ہو گئے تو سب سے پہلے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا انتظام کرنا چاہئے۔ حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اوّلاً تامل ہوا بالآخر وہ مطمئن ہو گئے اور پھر انہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا، پھر حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں ایک اور قدم اٹھایا کہ اپنے خاص اہتمام سے اور اپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کروا کر تمام بلادِ اسلامیہ میں روانہ کیں اور اس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت واشاعت' تعلیم وتبلیغ اور ترجمہ وتفسیر کے سلسلے میں خدمت قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔

پھر آئندہ صدیوں میں حدیث کے جمع وتدوین کا کام' مجتہدین کا استنباط احکام اور جزئیات فقہ کی تفریع، علم نحو وقرأت یہ تمام چیزیں مقصود کے حصول کیلئے وسائل کے درجے میں ہیں۔ پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو، اس کے ذرائع اور وسائل کی تصریح وتعین بھی کتاب وسنت میں ہونی ہی چاہئے اور امت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور تعین کے ساتھ کتاب وسنت میں ملنی چاہئے، بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاء کے طریق تعلیم اور اُصولِ تشریع سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تصوف کی جو غرض وغایت بیان کی ہے (یعنی اللہ کی محبت وخشیت اور یقین واستحضار اور اخلاص واحسان ان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا) سو اس کی دین میں اہمیت ہے اور یقیناً ایمان واسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس کی تعلیم دی ہے۔ کتاب وسنت کے جو نصوص اس حوالہ سے پہلے

لکھے جا چکے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت کیلئے کافی سے زائد ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے شریعت نے کچھ قواعد اور کچھ دستور اور طریقے متعین کئے ہیں، ان کو نہ تو بدلا جا سکتا ہے اور نہ انہیں ترک کیا جا سکتا ہے، یہ ذرائع قرب ورضا کے اعتبار سے تو ذرائع ہیں، ورنہ وہ بذات خود مقصود اور عبادت ہیں مثلاً نماز، روزہ، حج، ارکان، تلاوت کے اور ذکر وغیرہ۔

لیکن ان مقاصد کے حصول اور ان کے مذکورہ بالا وسائل کو عمل میں لانے کی راہ میں بہت سے موانع اور رکاوٹیں آتی ہیں۔ ان موانع اور رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے کچھ تدبیروں اور معالجات کی ضرورت پڑتی ہے۔ شریعت نے ان معالجات اور تدبیروں کو خاص شکل میں متعین نہیں کیا ہے، انہیں تدبیروں اور معالجات کو اُصولِ صوفیہ میں ''مجاہدات وریاضات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ مجاہدات نہ عبادت ہوتے ہیں اور نہ مقصود، اگر کسی شخص کو بغیر ریاضات کے مقصود حاصل ہو جائے تو ان کی کوئی ضرورت نہیں، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو آنحضرت ﷺ کی فیضِ صحبت اور کیمیاء اثر رفاقت کی وجہ سے ان اصطلاحی مجاہدات کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کیلئے نماز، روزہ، ذکر وتلاوت کافی تھے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا نفوس اور طبائع میں دنیاداری اور غفلت کا غلبہ ہوتا گیا۔ اب نماز، روزہ، تلاوت، اذکار وغیرہ سب موجود ہیں؛ لیکن خشوع وخضوع یقین واستحضار کی کیفیات نہیں رہیں جو کہ اس دین کی تکمیلی شعبہ جات سے تعلق رکھتے ہیں، جو قربِ خداوندی کا موثر ذریعہ ہیں۔

چنانچہ مولانا اسماعیل شاہ شہید تصوف کے ان وسائل (ذکر وشغل مراقبہ ومجاہدات) کے مقام اور ان کی شرعی حیثیت کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> صوفیہ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دوا ومعالجہ کی ہے کہ بوقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو۔(۱)

معالجہ کے یہ طریقے حالات کے اعتبار سے بدلتے ہیں اس حوالے سے ''صراطِ مستقیم'' میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

> ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں' اس لئے ہر طریق کے محققین تجدید اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔(۲)

---

(۱) ایضاح الحق الصریح : ۷۸ (۲) صراطِ مستقیم : ۷

اس لئے محققین یہ فرماتے ہیں کہ :

یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طریقے سے حاصل نہیں ہوتی۔ (القول الجمیل) بلکہ اگر کوئی ان طریق واوضاع اور اعمال واشغال کو مقصد جانتا ہے تو یہ حضرات اس پر نکیر کرتے ہیں۔

چنانچہ شاہ اسماعیل شہیدؒ فرماتے ہیں:

وظائف واذکار، ریاضات، خلوت، چلہ کو مقرر کرنا، ذکر جہری اور ذکر خفی کی وضعوں کو مقرر کرنا، ضرب عدد اور مراقبہ برزخیہ کا مقرر کرنا، اگر طالب ان سب کو اصل کمال شرعی یا مکمّلات میں سے جانتا ہے تو یہ سب بدعت حقیقیہ ہیں، لیکن خواص جو اس کو صرف وسائل وذرائع جان کر رواج دیتے ہیں، ان کے حق میں بدعت حکمیہ ہیں اور اخص الخواص جو ان چیزوں سے بہ وقت ضرورت کام لیتے ہیں اور پھر کام نکلنے کے بعد چھڑا دیتے ہیں ان کے حق میں یہ بدعت نہیں ہیں۔(۱)

محققین صوفیاء ان اشغال واعمال سے کس طرح کام لیتے ہیں اور پھر کس طرح ان سے الگ کرکے اصل مقصود میں لگا دیتے ہیں اس کو جاننے کیلئے حضرت گنگوہی مکاتیب رشیدیہ میں فرماتے ہیں:

جب سب اذکار ومراقبات تحصیل نسبت کے واسطے ہیں، جب نسبت یادداشت حاصل ہو چکی اب مراقبات کی درخواست عجیب بات ہے۔ اب تمہارا اذکر لسانی، قرآن وصلوٰۃ ذکر مسنون مراقبہ ہے، سب میں یادداشت ہے کہ ثمرۂ مراقبات یہی ہے، اب کسی مراقبہ کی حاجت نہیں اذکار مسنونہ پڑھو، قرآن ونوافل صلوۃ مسنونہ ادا کرو اور بس۔(۲)

تصوف کے مقصد اور اس کے اعمال واشغال کی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد عرض ہے کہ اگر کوئی خوش نصیب ایسا ہے کہ اس کو کسی ریاضت ومجاہدہ کے بغیر اخلاص واحسان کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے تو وہ بہت ہی مبارک ہے، ورنہ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کو جس چیز سے نفع ہوتا ہے اسی کو وہ دوسروں کو بتلاتا ہے۔ اہل اللہ کی بڑی جماعت (جن کے صدق وصفا پر سب کو اتفاق ہے) خبر دیتی ہے کہ ذکر وفکر کی راہ سے ان کو اخلاص ویقین کی دولت حاصل ہوئی، لہٰذا اگر کسی کو ان کیفیات مطلوبہ کی ضرورت اور تلاش ہے تو وہ اس راہ کو اختیار کرے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ راہ بحث ونظر کی نہیں بلکہ جدوجہد وعمل کی ہے۔

(۱) ایضاح الحق الصریح : ۳۷   (۲) مکاتب رشیدیہ : ۲۱

تصوف کے مقصد یعنی اخلاص ویقین کے حصول کیلئے ان وسائل (ذکر وشغل مراقبہ) کے موثر ومفید ہونے کا ثبوت اور ذکر کتاب وسنت میں نہ صرف اشارۃً بلکہ صراحتاً ملتا ہے (جس کیلئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طریقت وشریعت ملاحظہ ہو)۔

بالفرض اگر کتاب وسنت میں اس کا کوئی اشارہ نہ بھی ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں اللہ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ کر رہے ہیں کہ ان اعمال صالحہ سے کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادیت ہمیں مان لینا چاہئے کہ اس وقت سے لے کر اب تک خدا کے کثیر التعداد مخلص بندوں نے اس طریقہ کو اختیار کیا اور اس کی دعوت دی، خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ زمانی اور مکانی اختلاف کے باوجود صادقین ومخلصین کا یہ گروہ اس اعلیٰ باطنی اور روحانی کمالات کے حصول کے اس ذریعہ کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ اگر کسی مسئلہ کے سلسلہ میں عوام الناس کی اس قدر بڑی تعداد بھی اکٹھا ہو کر اس کی حمایت کرتی تو اس قدر بڑی تعداد کے جھوٹ پر متفق نہ ہونے کا خیال کر کے بات مان لی جاتی۔ یہاں پر صوفیاءِ کرام کے اس طریقہ (جس کا نام تصوف وسلوک ہے) یہ اصولاً صحیح اور نتیجۃً کامیاب ہے اور اس سے باتفاق نور یقین اور رابطہ مع اللہ یعنی احسانی کیفیت حاصل ہوتی ہے' اس پر مشاہیر اولیاءِ اُمت مثلاً خواجہ معروف کرخیؒ، بشر حافیؒ، سری سقطیؒ، شقیق بلخیؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، ابوبکر شبلیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ احمد رفاعیؒ، ابوالحسن شاذلیؒ، خواجہ عثمان ہارونیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ پھر ہمارے اس دوسرے ہزارہ کی گذشتہ چار صدیوں میں خواجہ باقی باللہؒ، امام ربانی مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے خلفاء اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ اور سید احمد شہیدؒ اُن جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد نے جن میں سے ایک ایک اپنے عہد کا گل سرسبدِ مینارۂ نور اور نوعِ انسانی کیلئے شرف وعزّت کا باعث تھا اس کی افادیت سے اتفاق کیا ہے، اگر ان بزرگانِ دین اور خلاصہ اُمت کے تجربہ پر ہمیں اعتماد نہیں تو پھر لائق اعتماد اور بھروسہ مند جماعت کونسی ہوگی؟۔ حالانکہ جو شخص ان بزرگوں اور ان کے احوال سے واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان بزرگوں کو جو کچھ حاصل ہوا اسی راہ سے حاصل ہوا تھا۔ لہٰذا اس طریقہ کار کے کامیاب اور مقبول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

تصوف کے اصطلاحات اوران کی حقیقت واہمیت

آج کا یہ دور جو کہ سطحیت کا دور ہے۔ علمی گہرائی وگیرائی ناپید ہوتی جارہی ہے' اسی سطح بینی اور سرسری مطالعہ نے نہ صرف یہ کہ تصوف کی اصطلاحات کو اچنبھا بنادیا ہے' بلکہ بعض خالص دینی اور علمی اصطلاحات بھی لوگوں کیلئے غیر مانوس اور اجنبی بن گئے' آج کل لوگ بجائے اس لئے کہ اپنی کوتاہ علم اور قصور نظر اور علمی کم مائیگی اور معلومات کی بے بضاعتی اور بے سروسامانی کا اعتراف کرتے جہاں کوئی لفظ ان کی عقل وفہم اوران کے شعور وادراک سے بالاتر نظر آتا ہے، ان الفاظ کو بے اثر اور بے معنی بتانے اوراس کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی انتھک کوشش کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام الفاظ اور اصطلاحات جو آج سے ایک صدی بیشتر نہ صرف یہ کہ مانوس تھے بلکہ ناخواندہ حضرات بھی اس کی حقیقت سے متعارف تھے، آج پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے اجنبیت محسوس کرنے لگے ہیں، یہی کچھ حال تصوف کی اصطلاحات کا بھی ہوا ہے کہ جو کہ خالص دینی اور علمی اور قرآن وحدیث سے مستنبط اصطلاحات ہیں، ان کی حقیقت تک عدم رسائی نے انہیں غیر مانوس اور اجنبی بنادیا ہے' ان اصطلاحات اوران کی حقیقت سے ناآشنائی کا لوگ اعتراف کرتے' اپنی کوتاہی عقل کی وجہ سے ان اصطلاحات کو ہدف تنقید بنانے لگے، اس لئے ضرورت اس بات کی متقاضی ہوئی تصوف کی ان مختلف اصطلاحات کی حقیقت واضح کردی جائے تاکہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ہم تصوف کی ان اصطلاحات کو اس کے مقاصد، وسائل اور توابع کے ضمن میں بالترتیب بیان کریں گے۔

ابوالحسن علی ندویؒ کا ایک مختصر وجامع اقتباس

اخیر میں ہم تصوف کی حقیقت وحیثیت اوراس میں مقاصد ووسائل کے فرق اوراس کے بارے میں غلط فہمیوں کی اصل وجوہات کو بتلانے کیلئے حضرت ندویؒ کا یہ اقتباس لکھنا مناسب سمجھتے ہیں جو اس حوالے سے نہایت جامع اور پرمغز ہے۔

تصوف کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ جہاں تک اس کے مقصد وحقیقت کا تعلق ہے وہ ایک متفق علیہ حقیقت ہے؛ لیکن اس کو ان ہی دو چیزوں نے نقصان پہنچایا کہ ایک وسائل کے

بارے میں غلو اور افراط سے کام لینا، دوسرے اصطلاح پر غیر ضروری حد تک زور دینا اور اس پر بے جا اصرار کرنا، اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اخلاص واخلاق ضروری ہیں یا نہیں؟ یقین کا پیدا ہونا مطلوب ہے یا نہیں؟ فضائل سے آراستہ ہونا اور رذائل سے پاک ہونا، حسد، کبر، ریاء، بغض اور کینہ، حب مال اور حب جاہ اور دوسرے اخلاقِ ذمیمہ سے نجات پانا، نفس امارہ کی شدید گرفت سے خلاصی پانا، کسی درجے میں ضروری یا مستحسن ہے یا نہیں؟ نماز میں خشوع وخضوع دعا میں تضرع وابتہال کی کیفیت، محاسبہ نفس کی عادت اور سب سے بڑھ کر اللہ ورسول اللہ کی محبت، حسی لذت وحلاوت کا حصول یا کم از کم اس پر شوق واہتمام، صفائی معاملات، صدق وامانت اور حقوق العباد کی اہمیت وفکر، نفس پر قابو رکھنا، غصہ میں آپے سے باہر نہ ہوجانا، کسی درجہ میں مطلوب ہے یا نہیں؟ تو ہر سلیم الفطرت انسان اور خاص طور پر وہ مسلمان جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے یہی جواب دے گا کہ یہ چیزیں نہ صرف مستحسن بلکہ شرعاً مطلوب ہیں اور سارا قرآن اور حدیث کے دفتر اس کی ترغیب وتاکید سے بھرے ہوئے ہیں، لیکن اگر کہا جائے کہ انہی صفات کے حصول کا ذریعہ وہ طریق عمل ہے، جس کو بعد کی صدیوں میں تصوف کے نام سے پکارا جانے لگا تو اس کے سنتے ہی بعض لوگوں کی پیشانی پر شکن پڑجائے گی، اس لئے اس اصطلاح سے ان کو وحشت اور اس کے بعض برخود علمبرداروں اور دعویداروں کے متعلق ان کے تجربات نہایت ہی تلخ ہیں۔

تصوف کے سلسلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو تمام اجزاء کو علحدہ علحدہ تسلیم کرتا ہے، لیکن جب اس کے مجموعے کو کوئی نام دیا جاتا ہے تو وہ اس سے انکار کردیتا ہے، ہم نے اوپر جن مقاصد اور صفات کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً سب لوگوں کو علحدہ علحدہ تسلیم ہیں، لیکن جب کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے (کسی وجہ سے) اس مجموعہ کا نام تصوف رکھ دیا ہے تو فوراً تیوری پر بل چڑھ جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ ہم تصوف کو نہیں مانتے اور تصوف نے بڑا نقصان پہنچایا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ اگر کوئی اس حقیقت کا نام بول کر پیش کرے تو اس کو قبول کرلیتا ہے مثلاً کہا جائے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام تزکیہ، حدیث کی اصطلاح میں اس کا نام احسان اور بعض علمائے متاخرین کی اصطلاح میں اس کا نام فقہ باطن ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سب

چیزیں منصوص ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک لکھی ہوئی ساری کتابوں میں نہ ترمیم ہوسکتی ہے اور نہ زبانِ خلق کو جو نقارۂ خدا کہی گئی ہے روکا جاسکتا ہے، ورنہ اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم اس کو تزکیہ واحسان کے لفظ سے یاد کرتے اور تصوف کا لفظ ہی استعمال نہ کرتے ،لیکن اب اس کا معروف نام یہی پڑ گیا اور یہ کسی فن کی خصوصیت نہیں، علوم وفنون کی ساری تاریخ اسی طرح کی مروجہ اصطلاحات سے پُر ہیں، محققین نے ہمیشہ مقاصد پر زور دیا اور وسائل کو وسائل ہی کی حد تک رکھا۔(۱)

نسبت کسے کہتے ہیں؟

ویسے تو نسبت کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں، ان میں سے چند سہل اور آسان فہم تعریفات کا ہم ذکر کرتے ہیں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:

اصطلاحِ صوفیاء میں جس کو نسبت کہا جاتا ہے اس تعلق مع اللہ کا نام ہے جس کے لوازم میں سے دو چیزیں ہیں ایک دوام طاعت، دوسرے کثرتِ ذکر۔

شیخ الحدیث زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ: یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس ناکارہ نے جواب دیا کہ تصوف کی حقیقت صرف تصحیح نیت ہے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی ابتداء "انما الأعمال بالنیات" اور انتہاء "ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ" اس کو یادداشت کہتے ہیں، اس کو حضوری کہتے ہیں اور اسی کو نسبت بھی کہتے ہیں، سارے مجاہدے اور مراقبے اور ذکر وشغل اسی کے حصول کیلئے کئے جاتے ہیں اور جس کو حق تعالیٰ یہ دولت عطا کردیں اس کو پھر کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔(۲)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نسبت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نسبت لغت میں دو شئے کے ارتباط کا نام ہے، طرفین میں جو علاقہ ہے وہ نسبت ہے اور جو دنیا میں مخلوق ہے اس کو اپنے خالق کے ساتھ ربط ہے وہ ربط کہ جس کی کوئی انتہا نہیں، جس قدر اسماء وصفات اور نزول رحمت ہے اسی قدر نسبتیں ہیں، مثلاً خالق ومخلوق میں نسبت خلق ہے، رازق ومرزوق میں نسبت رزق ہے، رحیم ومرحوم میں رحمت ہے، پس اس شئی کو نسبت کہتے ہیں

(۱) شریعت وطریقت کا تلازم: ۵۶-۵۷-۶۱ (۲) آپ بیتی : ۶

جو بندوں کو حاصل ہے، اس نسبت کا حقیقی حصول یہ ہے کہ اس نسبت کا علم یقین حاصل ہو کہ موثر ہو جائے اور حضور ﷺ کے درجے تک پہنچ جاتے۔(۱)

مشہور بزرگ اور محقق شیخ حضرت مولانا وصی اللہ نوّرہ اللہ حضرتِ محدّثِ دہلویؒ کی ایک عبارت جو نسبت سے متعلق ہے اس کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات، طہارات اور اذکار وغیرہ پر مداومت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کرنے کا ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے اور حصولِ نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو ادھر توجہ تام ہوگئی اور اس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہوگیا، ورنہ بندہ کو حق تعالیٰ سے نسبت ہوتی ہی ہے۔(۲)

خلاصہ یہ ہوا کہ نسبت یا ولایت کہتے ہیں تقرب الی اللہ اور حضور مع اللہ کو اور یہ بغیر تقویٰ، تزکیۂ نفس اور اتباعِ شریعت کسی کو حاصل نہیں ہوتی ،حصول اس کا حق تعالیٰ کی عطا پر مبنی ہے، مگر خلوص کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف توجہ دینے اور اشغال واوراد سلوک اختیار کرنے پر اللہ تعالیٰ کرم فرمادیتے ہیں۔ سلوک کے مقامات طے کرتے ہوئے جو کیفیت سالک کو محسوس ہوتی ہے اس کو بھی اس مقام کی نسبت کہتے ہیں، مثلاً نسبتِ صبر، نسبتِ توکل وغیرہ۔

صحبت اور اس کی تاثیر

جہاں تک انسانی طبیعت کا تعلق ہے، تمام زمانے کے عقلاء اس بات پر متفق ہیں کہ انسانی طبیعت کے بناؤ اور بگاڑ میں جس قدر صحبت اور معیت کو دخل ہے، اتنا کسی چیز کو نہیں، صحبت کی یہ تاثیر اس قدر بدیہی اور فطری مسئلہ ہے کہ جس پر کسی کی دورائے نہیں قرآن سے حدیث سے، اقوالِ علماء حتی کہ عام انسانی افراد سے یہ بات اس قدر محقق ہے کہ اس کیلئے کسی ثبوت کا پیش کرنا تحصیل حاصل ہے۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ساری فضیلت وکمال کا راز اسی ایک بات میں ہے کہ ان کو جناب نبی کریم ﷺ کی صحبت ومعیت ایمان وعقیدت کے ساتھ حاصل ہوئی تھی، اگر کسی کو یہ صحبت حاصل نہیں ہے تو وہ ایمان وعمل کے خواہ کتنے اونچے درج پر فائز ہو باتفاق امت اسے کسی صحابی کے مقابل نہیں رکھا جاسکتا۔

(۱) مکتوب بنام خلیل احمد، آئینہ سلوک : ۱۷۰ (۲) تصوف ایک تعارف : ۹۹

''حدیثِ حنظلہ'' میں بھی صحبت کی اسی اثر انگیزی کا ذکر ہے، یہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا یہ حال پاتے تھے کہ صحبت اور مجلس میں رہتے تو دل کی یہ کیفیت رہتی کہ ایک لحہ کیلئے غفلت نہ ہوتی اور غیب گویا شہود ہو جاتا، لیکن جب اپنے گھروں پر ہوتے یہ کیفیت نہ ہوتی۔

حضرتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کو قبر میں دفن کر کے ہم نے مٹی سے ہاتھ جھاڑے نہیں تھے کہ ہمیں اپنے قلوب بدلے ہوئے نظر آئے (یعنی حضور ﷺ کے اس عالم سے عالم برزخ میں منتقل ہو جانے سے ہمارے قلوب کی حالت میں فرق پڑا۔ ان دونوں روایتوں سے صحبت کا قلبی کیفیات میں مؤثر ہونا صاف طور پر معلوم ہوتا ہے)۔

ضرورتِ مرشد

اسی لئے مشائخ صوفیاء نے طریق کا مدار صحبت پر رکھا ہے، اس لئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی دینی کمال اور تقویٰ کا حسن و جمال حاصل کرنا ہو تو وہ کسی صاحب کمال، متقی وخوش فضال کو تلاش کرے، اس سے عقیدت و مناسبت ہو تو اس کی صحبت میں رہے، اس سے علم وعمل سیکھے، اس طریقے سے اسے کمال حاصل ہوگا۔ اس لئے طالب کا سہل کام اور پہلی قدم یہ ہونا چاہئے کہ اپنی رہنمائی کیلئے اپنی مناسبت کے لحاظ سے وہ کسی صاحبِ نسبت اور صاحبِ ارشاد بندہ کا انتخاب کرے اور اس سے اپنے باطنی امراض کے علاج اور رہنمائی کا طالب ہو۔

حدیث شریف میں ہے: عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المرء على دين خليله فلينظر أحدكم من يخالل (۱)

حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے، سو ذرا دیکھ بھال لینا چاہئے کہ کس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے۔

جب معمولی دوستی کا یہ اثر ہوتا ہے تو پھر شیخ اور استاذ جن سے اعلیٰ درجہ کی محبت وعقیدت اور احترام اور پاس ولحاظ ہوتا ہے ان کی صحبت ورفاقت کا کیا کچھ اثر نہ ہوگا۔ اس لئے تلاش مرشد میں بھی بہت احتیاط کرنی چاہئے۔

(۱) مستدرك : كتاب البر والصلة، حديث : ۸۳۱۹، تحقيق محمد مصطفى عبد القادر عطا.

شیخ کامل کی پہچان

ضرورتِ مرشد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص کہیں بھی پیر بن بیٹھا ہو وہ اس کی رہنمائی کا اہل ہو، کون اس صورتحال سے ناواقف ہے کہ آج کل جس طرح عالموں، مولویوں، طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ناقص وکامل اور نقلی سب طرح کے ہیں۔ اس طرح پیروں میں سب طرح کے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے یہاں نقل اصل سے زیادہ ہے، اس لئے محققین نے جو علم شریعت کے ماہر ہیں (مثلاً قریبی زمانے کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت قاضی ثناء اللہؒ) کتاب وسنت کے اشارات اور اپنی دینی فہم وفراست اور اس راہ کے تجربہ سے اللہ کے صادق بندوں کی ایسی علامتیں لکھی ہیں جن سے اہل قلوب اور اصحابِ ارشاد لوگوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی نشانی ان اللہ کے صادق اور صاحبِ نسبت وارشاد بندوں کی یہ لکھی ہے کہ تقویٰ واتباع شریعت کے ساتھ ان کی یہ کیفیت ہو کہ ان کے قریب رہنے سے خدا یاد آتا ہو۔ دنیا کی محبت کم ہوتی ہو اور اللہ کی محبت اور آخرت کی فکر بڑھتی ہو اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والوں میں یہ چیزیں صاف محسوس ہوتی ہوں۔ (۱)

جس شخص میں یہ علامات ہو، پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ شخص صاحبِ تصرفات ہے یا نہیں۔ یا اس کو کشف ہونا ہے یا نہیں، یا اس کی دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں، چونکہ یہ مقاصد سے نہیں زوائد ہیں۔

بیعت کا مفہوم اور اُس کی شرعی حیثیت

شریعتِ مطہرہ پر عمل آوری میں راہ کی رکاوٹوں اور نفسانی وشیطانی مکروفریب سے بچنے کا جب ارادہ ہوتا ہے تو اپنے کو کسی مردِ کامل اور شیخ طریقت کے سپرد کرنا بیعت کہلاتا ہے گویا بیعت گناہوں سے توبہ کا عزم مصمم اور نیکیوں کو اختیار کرنے کا ایک پختہ ارادہ ہوتا ہے، جس کیلئے کسی مردِ کامل کو اپنا گواہ بنایا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ حضرات مشائخ اور صوفیہ جب کسی سالک اور مرید کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے ہیں اور آئندہ معصیت نہ کرنے اور معصیت ہو جانے کی صورت میں توبہ کرنے کا عہد لیتے ہیں، مزید اعمالِ صالحہ پر استقامت اور سنت وشریعت کی کامل اتباع کا معاہدہ کراتے ہیں تو یہ کام خود سالک

(۱) دین وشریعت : ۲۴۸-۲۴۹

اورمرید کے کرنے کا ہوتا ہے،لیکن انسانی فطرت ہے کہ اپنے کسی عمل پر دوسرے کو گواہ بنالیتا ہے تو اس میں پختگی آجاتی ہے اوراس کا اہتمام بڑھ جاتا ہے،اسی اپنے عمل پر کسی مردکامل کو گواہ بنالینے کا نام بیعت ہے خود قرآن کریم میں ایمان وعمل صالح پر بیعت لینے کا ذکر موجود ہے۔یہ بیعت 'بیعتِ جہاد، بیعتِ ہجرت'بیعتِ طاعت'بیعتِ اسلام کے علاوہ ہے۔گویا بیعت توبہ یا تقویٰ ہے'اس بیعت سے متعلق ارشاد خداوندی ہے :

يَـا أَيُّهَـا النَّبِىُّ اِذَا جَاءَ كَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰى أَنْ لَّايُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْـرِقْـنَ وَلَا يَـزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْـدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِىْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْلَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌرَّحِيْمٌ.(۱)

اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس غرض سے آئیں کہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی،چوری نہ کریں گی،زنا نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، کسی پر بہتان نہ باندھیں گی اور بھلائی میں تمہاری نافرمانی نہیں کریں گے،تو ان کو بیعت کرلو اور ان کیلئے اللہ سے استغفار کرو،بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔

یہ تو گناہوں سے اجتناب سے متعلق بیعت ہے،جسے بیعتِ توبہ یا بیعتِ تقویٰ کہتے ہیں،اس بیعت کی بنیاد یہ آیت ہے اور یہ بیعت اسلام بھی نہیں ہے اس لئے کہ مخاطب مومن عورتیں ہیں۔

اسی بیعتِ تقویٰ کو اس روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

عن عوف بن مالك الاشجعى رضى الله عنه قال كنّا عند النبى سبعة او ثمانية اوتسعة، فقال الا تبايعون رسول الله فبسطنا ايدينا، فقال قائل يا رسول الله انا قد بايعناك فعلى ما نبايعك قال ان تعبد الله ولا تشركوا به شيئًا وتقيموا الصلوة الخمس واستمعوا وتطيعوا، واسرّ كلمةً خفيّة ولا تسئلوا النّاس شيئا (۲)

(۱) الممتحنة : ۱۲
(۲) سنن الكبرىٰ للبيقهى، باب كراهية السؤوال والترغيب والترك، حديث: ۳۶۵۷ مع تحقيق محمد عبد القادر عطا.

حضرتِ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم سب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے ہماری تعداد' سات تھی یا آٹھ تھی یا نو' سرکار ذی وقار نے فرمایا کہ: کیا تم لوگ اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کروگے تو ہم لوگوں نے ہاتھ بڑھایا۔وہاں موجود ایک صاحب نے کہا: یارسول اللہ ﷺ ہم لوگ تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں اب ہم آپ سے کس بات پر بیعت کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا (بیعت اس بات کی کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کروگے، کسی کو اس کا شریک نہ کروگے، پانچوں وقت کی نماز ادا کروگے (اللہ اور اس کے رسولوں کے حکم کو) سنوگے اور اطاعت کروگے اور آہستگی سے فرمایا کہ کسی سے کچھ مانگنا نہیں۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ بیعتِ تجدید عہد کے طور پر لی تھی،تا کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ ایمانی زندگی گذاریں بعض صحابہ جو تازہ اسلام لائے تھے اور بیعتِ اسلام وایمان کر چکے تھے انہیں پہلے مرحلہ میں حیرت بھی ہوئی کہ یہ دوسری بیعت کیسی؟ اس روایت کا یہ جملہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے:

فقال قائل يارسول الله انا قد بايعناك فعلى مانبايعك (۱)

ایک کہنے والے نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں،اب ہم کس بات پر بیعت کریں؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کے تعجب کا رفعیہ یوں فرمایا کہ :

بیعت اسلام کے سوا دوسری بیعت بھی ہوتی ہے، پھر آپ نے وہ اُمور ذکر فرمائے اور پھر دوسرے صحابہ کے ساتھ ان کی بھی بیعت لی اور یہی بیعت تقویٰ ہے کیونکہ کلمات بیعت میں اسلام لانے کا تذکرہ نہیں ہے۔نہ جہاد کی تلقین کی گئی ہے،نہ ہجرت کا حکم دیا گیا ہے،روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ سب مشرف بہ اسلام تھے یہ اسلامی احکام کی تعمیل اور تکمیل پر بیعت لی گئی،اسے بعض روایات میں بیعت نساء (قرآنی آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بھی کہا گیا ہے۔(۲)

اور جسے بیعت تقویٰ کہتے ہیں جسے بزرگوں نے بیعت توبہ کہا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس بیعت کی حقیقت اس حدیث کی روشنی میں یوں بیان فرماتے ہیں :

(۱) سنن الكبرىٰ للبيقهى، باب كراهية السؤوال والترغيب والترك، حديث: ۳۶۵۷ مع تحقيق محمد عبد القادر عطا. (۲) اوجز المسالك : ۱۲

حضراتِ صوفیاءِ کرام میں بیعت کا معمول ہے، جس کا حاصل التزام احکام (یعنی احکام ظاہری وباطنی پر استقامت) اور اہتمام کا معاہدہ ہے، جس کو ان کے عرف میں بیعت طریقت کہتے ہیں، بعض اہلِ ظاہر اس کو اس بناء پر بدعت کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ سے منقول نہیں ہے، صرف کافروں کو بیعت اسلام اور مسلمانوں کو بیعت جہاد کرنا معمول ہے، مگر اس حدیث میں صریح اثبات موجود ہے کہ یہ مخاطبین چونکہ صحابہ ہیں، اس لئے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں ہے کہ تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں ہے، پس اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (۱)

بیعت کی ضرورت

یہ بات یقینی ہے کہ بیعت کی ضرورت اس درجہ عام نہیں کہ ہر شخص کو اس کا پابند بنایا جائے، بہت سی سلیم طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ خود بخود نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور مختلف اسباب وعوامل سے ان کے اندر تقویٰ ودیانت اور بھلائی کا رجحان ہوتا ہے، ایسے لوگ بیعت نہ ہوں تو مضائقہ نہیں، لیکن عام انسانی طبائع کی حالت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے، اس لئے ان طبائع کا لحاظ کرتے ہوئے بیعت کی ضرت کا احساس ہوتا ہے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

نفس میں بعض خفیہ امراض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جاتے ہیں تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا اور جو معلوم ہوتا ہے تو نفس کی کشاکش سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے، ان ضرورتوں سے پیر کامل تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے، ان کا علاج اور تدبیر بتاتا ہے اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے۔ (۲)

ریاضات ومجاہدات

اہلِ تصوف کے یہاں تلاش مرشد کے بعد سب سے اہم کام ریاضت اور مجاہدۂ نفس کا ہے اور یہ بات صرف اسی فن کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ آدمی کوئی بھی کمال حاصل کرنا چاہے تو اسے

(۱) شریعت وطریقت : ۵۸ (۲) شریعت وطریقت : ۶۰

محنت ومجاہدہ کے اس مرحلہ سے گذرنا پڑتا ہے، کاشت کار سے لے کر صاحب قلم وقرطاس ہر شخص کو دیکھ لیں بغیر مغزماری اور جگر کاوی کے وہ میدان سر نہیں ہوتا ہے یہی حال علوم دینیہ ودنیویہ کا ہے کہ اُستاذ کی رہنمائی کے بعد مجاہدہ اور محنت ہی انسان کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرتے ہیں۔ آرام وچین کو تج دینا، فاقے کرنا، سردی گرمی کو برداشت کرنا، کونسی ایسی مشقت ہے جو حصولِ علم کے راہ میں نہیں ہوتی، تمام راتوں جاگنا، تکالیف حصولِ علم اور حصولِ کمال کے خاطر برداشت کی جاتی ہیں، شیدایانِ علم کے مجاہدوں کی داستانیں کتابوں میں رقم ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ ہر کام کیلئے مجاہدہ مُسَلَّمْ اگر صوفیہ قربِ خداوندی کیلئے مجاہدہ کا نام لیں تو لوگوں کے پیشانیوں پر بل آنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی ماہر فن استاذ اپنے شاگردوں کیلئے اس فن پر عبور حاصل کرنے کیلئے کوئی خاص مجاہدہ یا محنت ومشقت تجویز کرے، تو ہم اس فن کے حصول کے خاطر اس مجاہدہ ومحنت کو بطور وسیلہ کے اپنانے میں کوئی تردد نہیں کرتے، یہی بات جب نور یقین اخلاص واحسان اور تمام باطنی خصوصیات کے حصول کیلئے صوفیاء بطور تدبیر کے کچھ ریاضات سالکینِ طریق کیلئے تجویز کرتے ہیں تو فوراً اس کیلئے کتاب وسنت سے دلیل مانگی جاتی ہے، یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ عزوجل نے انسان کے اس مادّی جسم کے ساتھ جو عناصر اربع (ہوا، آگ، پانی، مٹی) سے مرکب ہے، ایک غیر مادّی چیز بھی جوڑ رکھی ہے، جس کا تعلق جسم سے کم اور عالمِ غیب سے زیادہ ہے، جس طرح محسوس چیزوں کے ادراک وعلم کیلئے اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی میں مختلف اعضاء بنا کر ان میں احساس کی طاقت رکھی ہے، مثلاً آنکھ میں دیکھنے، کان میں سننے، زبان میں ذائقہ، ناک میں سونگھنے اور کھال میں چھونے کی طاقت رکھی ہے، اس طرح عالم غیب کی چیزوں کے ادراک کیلئے روح کو جسم کا ایک حصہ عطا فرمایا اور اس میں امورِ غیبیہ کی ادراک کی قوت ودیعت کی اس کا نام "قلب" ہے۔

جس طرح جس حاسّہ سے کام لیا جاتا رہے گا وہ کارآمد رہے ہیں اور جس حاسّہ کو معطل کر دیا جائے وہ رفتہ رفتہ اس کی اپنی طاقت کھودے گا، مثلاً ہمیشہ آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، اس سے کام نہ لیں تو وہ کچھ مدت نہیں گذرے گی کہ اس کی بصارت کمزور ہو کر ختم ہوجائے گی۔ یہی حال دل کا ہے، اگر اس کو امورِ غیبیہ سے جوڑے رکھا گیا اور اس کے موانع دور کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس کو غیبی امور کے ساتھ مناسبت باقی رہے گی۔ یہ مجاہدات، اذکار، اشغال اور مراقبات اس لئے کروائے جاتے ہیں کہ دل کی قوت میں اضافہ ہو اور اس میں عبادات وطاعات کا ذوق بڑھے۔

مجاہدات کی شرعی حیثیت

مجاہدہ کی شرعی حیثیت کو بیان کرتے ہوئے حضرت اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

مجاہدہ ضروری کاموں میں سے ہے، کیونکہ شریعت میں اس کا حکم دیا گیا ہے، نصوص میں جا بجا مجاہدہ کا ذکر ہے، پس اس کی تفسیر وہی ہونی چاہئے جو شریعت نے بتلائی ہے، اس لئے مجاہدہ تمام عبادات' بلکہ تمام شریعت کی روح ہے اور اصطلاح میں مخالفت نفس کا نام مجاہدہ ہے اور دین بھی سارا مجاہدہ ہی ہے، کیونکہ مخالفت نفس میں تعب ضرور ہوتا ہے اور دین کا خلاصہ بھی مشقت ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ نفس کے اوپر پابندی لازم ہوتی ہے اور نفس پر پابندی گراں ہے، وہ تو طبعی طور پر آزادی کا طالب ہے، نفس پر اعمال دینیہ شاق ہوتے ہیں۔ اس لئے دین کا نام تکلیف ہے اور احکام شرعیہ کو احکامِ تکلیفیہ کہا جاتا ہے اور بندے کو مکلف کہتے ہیں۔ تو مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق وعادت ہے۔ حق تعالیٰ کی رضا وطاعت کے مقابلے میں نفس کی جانی ومالی اور جاہی خواہشات ومرغوبات کو مغلوب رکھا جاسکے۔ اسی مجاہدہ پر ہدایت کا وعدہ ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۱) جو لوگ ہماری راہ میں مشقت برداشت کرتے ہیں ہم ان کو قرب وثواب یعنی جنت کے راستے ضرور دکھائیں گے۔

ایک روایت میں ہے: عن فضالة الكامل قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المجاهد من جاهد من نفسه فى طاعة الله.(۱)

حضرت فضالہ کامل سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجاہدہ وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

مجاہدہ کے اقسام اور ارکان

صوفیاء کے نزدیک مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں جس کو اختیار کئے بغیر مقصود کا حصول ممکن نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:

(۱) عنکبوت: ۳۶۵۷ (۲) شعب الایمان: باب السابع والسبعون من شعب الایمان حديث : ۱۱۱۲۳، تحقيق محمد السعيد ، مطبوعة بيروت

مجاہدہ دو قسم کے ہیں: مجاہدۂ جسمانی، مجاہدہ مخالفتِ نفس

مجاہدۂ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی بنایا جائے، مثلاً نوافل کی کثرت، روزے سے کھانے وغیرہ کی حرص کم کرنا۔

مجاہدہ مخالفتِ نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت کا تقاضہ کرے اس وقت اس تقاضہ کی مخالفت کرنا۔ اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ بھی اس کی تحصیل کیلئے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہوجائے گا تو اس کو اپنے جذبات ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی، لیکن اگر کسی کو بغیر مجاہدۂ جسمانی کے نفس پر قدرت حاصل ہوجائے تو اس کو مجاہدۂ جسمانیہ کی ضرورت نہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں، اس کے صوفیاء نے مجاہدۂ جسمانیہ کا اہتمام کیا ہے۔(۱)

مجاہدۂ جسمانی کے چار ارکان ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی فن میں اعلیٰ کمال کو حاصل کرنے کیلئے ان چاروں مشقتوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

۱- کھانے میں اعتدال۔ ۲- سونے میں اعتدال۔

۳- لوگوں سے میل جول میں اعتدال ۴- بات چیت میں اعتدال

یعنی ان تمام امور کو بقدر ضرورت اپنایا جائے ایسا نہیں جو چیز مل گئی کھا گئے، بلکہ بقدرِ ضرورت، ایسے ہی زیادہ نہ سویا جائے اس سے سستی پیدا ہوتی ہے زیادہ نہ بولا جائے اس میں وقت اور قوت کی بچت ہوتی ہے، ایسے ہی خلوت اختیار کی جائے تاکہ کام کی تکمیل میں حرج نہ ہو۔ یعنی ان چاروں چیزوں میں کمی کرنی ہے لیکن اعتدال کے ساتھ نہ حد سے زیادہ کمی کی جائے جس سے رہبانیت لازم آئے اور نہ حد سے زیادہ ان چیزوں کو اختیار کیا جائے کہ انسان کی ساری قوت اور صلاحیت انہیں چاروں چیزوں پر صرف ہو، بلکہ اعتدال اور میانہ روی شریعت کی ہر چیز میں مطلوب ہے۔

چنانچہ حضرت تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) شریعت وطریقت: ۸۰

پس مجاہدہ میں اعتدال کی رعایت کرنا چاہئے، مگر اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کرے، بلکہ کسی محقق سے درجہ اعتدال اور طریق مجاہدہ معلوم کرے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کے تجویز میں سلوک وطریق کے ماہرفن سے دریافت کیا جائے اور اسی کے بقدرِ مجاہدہ کرے اس لئے کہ احوال وامراض ہر ایک کے مختلف ہوتے ہیں اسی اعتبار سے علاج تجویز کئے جاتے ہیں۔

اذکار...اشغال....مراقبات

تصوّف کے بارے میں تیسری اہم چیز اذکار، اشغال اور مراقبات ہیں۔

اذکار

ذکر کی دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت سے تو یہ مقاصد میں داخل ہے ارشاد خداوندی ہے :

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (۲)

''اے ایمان والو اللہ کا ذکر بکثرت کرو''۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِىْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ۔(۳) اور اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح وشام اور غافلوں میں سے مت ہو۔ غفلت ذکر کی ضد ہے، غفلت حرام ہے اور ذکر فرض ہے اور یہ خود مطلوب ہے۔

لیکن ذکر کی دوسری حیثیت مقصود ومطلوب کیلئے معاون اور ذریعہ کی ہے، چونکہ مقاصدِ شرعیہ میں سے محبتِ الٰہی کا حصول بھی ہے، جس قدر اللہ کا ذکر کیا جائے اسی قدر اللہ سے محبت ہو اور محبت کے بعد خدا کی اطاعت وبندگی پر دوام اور اس کے نتیجے میں قرب خداوندی حاصل ہوگا۔ مقصود ہونے کے اعتبار سے صوفیاء اپنی پوری زندگی کو ذکر سے سرشار رکھتے ہیں جو ''ذکر کثیر'' کا اعلیٰ مصداق ہے۔ یہاں تک کہ ذکر کا رنگ ان پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آنے لگتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں نیک لوگوں کی علامت بیان کی گئی ہے۔

(۱) وعظ، المجاہدہ تعلیم الدین (۲) الاحزاب : ۴۱ (۳) الاعراف : ۲۰۵

اذا رُءوا اذكر الله...... جب ان پر نظر پڑے تو خدا یاد آجائے لیکن ذکر کا یہ رنگ ان پر چڑھے کیسے اس کے لئے بطور وسیلہ کے ذکر ہی کو استعمال کیا گیا اور اس طرح کے ذکر کے مختلف طریقے تجربے کی رو سے تجویز کئے گئے، ان کی خاص تعداد متعین کی گئی، ان کی وضع وہیئت مقرر کی گئی، جہر اور سر کی حد بنائی گئی۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ ذکر بجلد اور بعجلت دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث میں ذکر کا مطلق حکم ہے، اس مطلق حکم کی تعمیل کیلئے اگر کوئی خاص طریقہ اس مطلق حکم کی تعمیل کیلئے اگر کوئی خاص طریقہ بشرطیکہ وہ جائز ہو، وضع کیا جائے اور اُسے بطور وسیلہ کے عمل میں لایا جائے، اس طریقہ کو مقصود اور عبادت نہ قرار دیا جائے تو اس میں کیا کلام ہوسکتا ہے حضراتِ صوفیاء بھی ذکر کا جہراً حکم دیتے ہیں، کبھی اس کیلئے سیکھنے کی کوئی خاص ہیئت بتاتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ مثلاً لا الٰہ پر سر اور گردن کو پیچھے لے جاؤ اور یہ خیال کرو کہ غیر اللہ کی محبت اور اس کا اثر دل سے خارج ہو رہا ہے اور پھر الا اللہ کی ضرب دل پر لگاؤ اللہ کا نور یا اللہ کی محبت دل میں پیوست ہو رہی ہے، ان ضربوں کا مقصد یہ ہے کہ دل سے غیر اللہ کی محبوبیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت راسخ ہو جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے یہ طریقہ زیادہ موثر ثابت ہوا ہے، کبھی مشائخ ذکر قلبی کی تلقین کرتے ہیں اور اس کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً یہ خیال کرو کہ دل کی دھڑکنیں بول رہی ہیں اور اللہ اللہ کر رہی ہیں یہ طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں کہ ذکر کا رسوخ ہو جائے، کبھی پورے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی مشق کراتے ہیں، کبھی الا اللہ کی ضرب لگاتے ہیں کبھی صرف اللہ اللہ رٹاتے ہیں یہ سب تمرینات ہیں اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اس سے قلب پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ سب وسائل اور ذرائع ہیں، انہیں بدعت قرار دینا کج فہمی کا نتیجہ ہے۔(۱)

اشغال

''شغل'' بھی صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دل کی توجہ کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کیلئے کوئی عمل کیا جائے تا کہ اس سے یکسوئی پیدا ہو، مثلاً لفظ اللہ موٹے حروف میں لکھ کر اس پر نگاہ جمائی جائے کہ پلک تک نہ جھپکے، اس سے قلب کی یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور اس پر کچھ ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جس سے ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے پھر دل تشویشات سے خالی ہو کر ہمہ تن متوجہ بحق رہتا ہے۔ ایسے ہی سانس روکنے کا عمل جو ''حبس دم'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(۱) تصوّف ایک تعارف : ۸۷

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

اشغال کا مقصود یہ ہے کہ دل کا انتشار جو ہجوم افکار کا باعث ہوتا ہے ختم ہو کر جمعیت خاطر اور خیال کی یکسوئی حاصل ہو! تا کہ اس کے خوگر ہونے سے توجہ تام حاصل ہو۔ نماز میں سترہ کا حکم اس عمل کا ماخذ ہے کیونکہ تبصریح علماء سترہ کا مقصود بھی جمع خاطر اور ربطِ خیال اور انتشار کا دفعیہ ہے جیسا کہ ابن ہمام نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے اور سترہ اس کی تدبیر ہے۔ (۱)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :

غرض جتنے اشغال ہیں وہ جمع خاطر کیلئے ہیں مقصود بالذات نہیں، ذکر کے وقت اگر قلب میں جمعیت و خشوع معلوم ہو اور وہ روزانہ بڑھتی جائے اور وساوس و خطرات میں کمی ہونے لگے اور دل لگا کرے تب تو اشغال کی حاجت نہیں اور اگر ایک مدت تک ذکر کرنے سے قلب میں یکسوئی خشوع نہ ہو تو مناسب ہے کہ کوئی شغل بھی کر لیا جائے۔ (۲)

مراقبات

مراقبات بھی حضرات صوفیہ کے اصطلاحات میں سے ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا یا اس سے متعلق کسی اور مضمون کا اکثر احوال یا کسی محدود وقت میں دل سے پورے تدبر اور کامل غور و فکر کے ساتھ خیال جمائے۔ اس تصور پر مواظبت کرے تا کہ اس کا مقتضا حاصل ہو، یہی عمل مراقبہ کہلاتا ہے، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان تعبد اللہ کانّك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے (اسی کو مراقبۂ رؤیت کہتے ہیں)۔

مشائخین' اللہ عزوجل کے اس گہرے تصور کو دل و دماغ میں بٹھانے کیلئے مختلف مراقبات کرواتے ہیں جیسے مراقبۂ موت (اپنے آپ کے مرنے کا تصور) مراقبۂ عذاب آخرت، اس طرح کے مراقبے جو مشائخ تجویز کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار تام حاصل ہو جائے۔

(۱) شریعت وطریقت : ۲۷۳ (۲) شریعت وطریقت : ۲۷۴

احوال

یہ حقیقت ہے کہ جب آدمی کسی فن میں محنت اور جستجو کرتا ہے، اس کے اندر کمال اور مہارت تام کے حصول میں لگا رہتا ہے تو آہستہ آہستہ تجربات کی روشنی میں اس فن سے متعلق بہت سے اسرار اور غوامض اس پر کھلنے لگتے ہیں عجیب عجیب تجربات سے وہ گذرتا ہے، اس دوران اسے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اس کے وہم و گمان اور تصور میں نہیں تھی، وہ اس تجربات کی راہ سے گذر بدیہیات اور مشاہدات کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ تجربہ کسی خاص فن میں نہیں ہوتا معمولی کاشتکاری سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ فن میں اس کا ماہران تجربات ومشاہدات سے گذرتا ہے۔

اِسی طرح اِنسان جب اپنے باطن کی اصلاح اور نفس کے تزکیہ کی راہ پر قدم رکھتا ہے، وہ پوری قوت وہمت کے ساتھ ذکر کے نور سے اپنے دل کو منور کرتا رہتا ہے اور شب و روز اس کی یہی ایک دھن اور مصروفیت بن جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کچھ کچھ خاص کیفیات اپنے فضل سے اس کے دل پر القاء فرماتے ہیں' اس پر غیبی حقائق کا انکشاف ہونے لگتا ہے، اگر وہ عالی استعداد کا حامل ہوتا ہے تو قرآن وسنت کے حقائق واسرار اس پر کھلتے ہیں، انہیں کیفیات کو صوفیاء اپنی خاص اصطلاح میں ''احوال'' کہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ ''القول الجمیل'' میں ارشاد فرماتے ہیں :

جن لوگوں کو سکینہ پر دوام اور استقامت نصیب ہوتی ہے انہیں کے بعد دیگرے بلند احوال نصیب ہوتے ہیں۔ سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس بات کی علامت ہیں کہ اس کی طاعت اللہ کے نزدیک مقبول اور یہ کہ اس کا باطن اور دل اطاعتِ الٰہی سے متاثر ہے۔ (۱)

۱- دوام رضا واطاعت کا حصول

سالک کو حصول نسبت کے بعد ایک عظیم القدر حال یہ نصیب ہوتا ہے کہ وہ نفس کی شدید کشمکش سے نجات پا کر اللہ کی اطاعت کو دوسری چیزوں پر ترجیح دینے لگتا ہے، اس کا ایک ہی مطمحِ نظر ہوتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو جائے۔

(۱) تصوف ایک تعارف : ۹۷

۲- خوف وخشیت کا غلبہ

اس طرح ایک بڑی دولت یہ نصیب ہوتی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی خشیت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ آثار قلب سے جھلک کر بدن اور دوسرے اعضاء پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

۳- رویاءِ صالحہ

صاحبِ نسبت شخص کو حق تعالیٰ کی جانب رویا صالحہ (اچھے خواب) کی نعمت میسر آتی ہے، جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ نیک آدمی کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔

۴- فراستِ صادقہ

اس طرح صاحب نسبت شخص کو اس دنیا میں فراست صحیح کی دولت نصیب ہوتی ہے، یعنی دل میں ایسی بات آجانا جو حقیقت کے مطابق ہو، اس لئے حدیث میں آتا ہے: "اتّقوا فراسة المؤمن فإنّه ينظر بنور الله" (۱) یعنی مومن کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

۵- قبولیتِ دُعا

صاحبِ نسبت کو ایک بڑا انعام حق تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ ملتا ہے کہ اس کی اکثر دعائیں قبول ہوتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ بندے کو ایسی نسبت اور ایسا تعلق باریٔ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی جس ضرورت کیلئے جہد و ہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے عطا فرماتے ہیں۔

۶- اس کے قسم کی تکمیل

اسی طرح صاحبِ نسبت کو ایک بلند مقام یہ نصیب ہوتا ہے کہ اگر اللہ پر توکل کر کے کسی بات کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: "رب اشعث اغبر لو اقسم على الله لأبرّه" (۲) یعنی بہت سے غبار آلود، پراگندہ بال، پھٹے پرانے کپڑے والے، جن کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا، لیکن اللہ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتے ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیں۔ (۳)

(۱) سنن الترمذی: سورۃ الحجر، حدیث: ۳۱۲۷، مع تحقیق احمد محمد شاکر
(۲) کنز العمّال: باب الحمول، حدیث: ۵۹۲۵ (۳) تصوّف ایک تعارف: ۱۰۰

یہ چند خدائی انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے صاحبِ نسبت کو حاصل ہوتے ہیں، اس کے علاوہ اور دیگر احوال ہیں جس سے یہ شخص سرفراز کیا جاتا ہے۔

۷- الہام

ایک بڑی نعمت صاحب نسبت کو جو ملتی ہے وہ الہام ہے۔ الہام کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر نظر و استدلال کے اللہ تعالیٰ کوئی حقیقت بندے کے قلب میں القاء فرما دیں، یا کسی غیبی مخلوق کے ذریعہ اطلاع بخش دیں جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدۂ محترمہ کیلئے ارشاد ہے: "وَ أَوْحَيْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِيْهِ" (۱) ہم نے موسیٰ کی ماں کے جانب وحی کی کہ دودھ پلاتی رہو۔

۸- کشف

یہ بھی الہام اور فراست سے مشابہ ایک بڑی نعمت ہے جو اہلِ نسبت کو میسر آتی ہے، کشف کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے قلب میں عالم غیب کی چیزیں منکشف ہو جائیں اور وہ انہیں ایسے دیکھ لے، جس طرح ظاہری آنکھ سے دنیا کی چیزیں دیکھتا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرتِ انس بن نضر رضی اللہ عنہ کا یہ قول مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ "انی لأجد ريحها من دون احدٍ" (۲) میں جبل احد کے پیچھے جنت کی خوشبو پاتا ہوں۔

اس روایت کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

محمول على ظاهره، وأن الله واجد ريحها من موضع المعركة

یہ روایت اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی خوشبو میدان جنگ میں محسوس کرادی۔

۹- کرامت

یہ بھی کشف کے مانند ایک بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور صاحب نسبت بندے کو عطا کرتے ہیں، جس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ خلافِ عادت اُمور اس سے ظاہر ہونے لگتے ہیں، جیسے

(۱) القصص: ۷ (۲) صحیح بخاری: باب قول الله 'من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه، حدیث: ۳۶۵۱، مع تحقیق مصطفى ديب البغا.

حضرت مریم کیلئے بے موسم کے پھل کا موجود ہونا وغیرہ۔ یہ ہم نے چند تصوف کی اصطلاحات کا اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

تجدیدِ تصوف وسلوک

گذشتہ سطور میں ہم نے تصوف کی جو حقیقت بیان کی ہے کہ اس اعتبار سے تصوف کوئی دین وشریعت سے کوئی علیحدہ اور مستقل چیز نہیں ہے، بلکہ یہ دین ہی کا تکمیلی شعبہ ہے، جس کو اپنا کر ہی حقیقت میں اللہ عزوجل کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کیا جا سکتا ہے دین کے دیگر شعبہ جات کی طرح دین کا یہ اہم اور تکمیلی شعبہ بھی نام ونہاد، شہرت کے طالب جاہل صوفیا کے دست وبرد سے خالی نہیں رہا ہے۔ انہوں نے اپنے مطلب براری اور عزت وشہرت کا سکہ جمانے کیلئے بہت ساری غیر اہم چیزوں کو یا تو اہمیت اور اصلیت کا درجہ دے دیا یا غیر متعلق چیزوں کو اس شعبہ کے ساتھ منسلک کر دیا۔ یہی چیز دراصل دین کے اس اہم شعبہ کی بدنامی اور اس کے نام سے لوگوں کے بدکنے کا باعث ہوئی۔ چنانچہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ دوسری چیز جس نے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کر دیا، وہ پیشہ ور، جاہ طلب، حقیقت فروش اور الحاد شعار اور فاسد العقیدہ نام ونہاد صوفی ہیں، جنہوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی وبے قیدی کی تبلیغ کرنے کیلئے تصوّف کو آلۂ کار بنا لیا اور اس کے محافظ اور علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت اور اہلِ حمیت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے بدظن ہو گئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبے کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے ناآشنا تھے، وہ مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کر سکے بعض اوقات انہوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا اور مقاصد کو نظر انداز کر دیا اور اس شعبہ میں ایسی چیزیں داخل کیں، جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس کو اس فن کی روح اور اس کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود ومطلوب سمجھ بیٹھے، بسا اوقات انہوں نے دین کی اس روح اور زندگی کی اس ضرورت کو معمر فلسفہ اور رہبانیت بنا کر پیش کیا، ان تمام وجوہ واسباب کی بناء پر دین کا یہ اہم شعبہ لوگوں کیلئے غیر مانوس ہو گیا۔ (۱)

(۱) تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک : ۱۷-۱۸

لیکن اللہ عزوجل کا یہ قانون اور دستور رہا ہے کہ وہ جب بھی دین میں تحریف یا تزویر کی جانے لگتی ہے تو اس کو مبالغہ کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک وصاف کرنے کیلئے رجال کار پیدا کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اس دور اخیر میں بھی جب یہ شعبہ ان جاہل، حقیقت ناآشنا، خودغرض جاہل صوفیا کی زیادتی اور تحریف کا نشانہ بنا تو اللہ عزوجل نے ان کے اس ناپاک عزائم کو ملیامیٹ کرنے اور تصوف کے حقیقی تابناک وروشن چہرے کو عوام الناس کے سامنے لانے کیلئے بڑے بڑے مردِ میدان پیدا کئے۔ جنہوں نے ان کے اغلاط وضلالات کی قلعی کھول کر اس کا کچا کٹھا الگ کر دیا۔ چنانچہ مولانا منظور صاحب نعمانیؒ اس حوالہ سے یوں ارشاد فرماتے ہیں:

''جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کے دیگر شعبوں کی غلطیوں کی اصلاح علماءِ ربانی اور مجددینِ امت کے ذریعہ ہوتی رہی ہے، اسی طرح اس شعبۂ احسان وتصوّف کے سلسلہ کی اغلاط وضلالات کی اصلاح بھی منجانب اللہ محققین صوفیاء کرتے رہے ہیں۔

خاص کر ان آخری تین چار صدیوں میں تصوّف کی اصلاح وتجدید کا جو کام ہندوستان میں ہوا ہے، وہ تو دودھ اور پانی کو الگ الگ کرنے کا بہترین نمونہ ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور ان کے فرزند وجانشین خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات کے ضخیم ضخیم دفتر پھر حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ کی تصانیف اور ان کے مکاتیب، پھر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا مرتب کیا ہوا حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات وافادات کا مجموعہ (صراطِ مستقیم) اور پھر خاص ہماری اس صدی میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کے اس سلسلہ کے رسائل ومکاتیب اور سب سے اخیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا تصنیف کیا ہوا اس سلسلہ کا پورا کتب خانہ ان کوششوں نے تصوف کو اتنا صاف وروشن اور ایسا بے غل وبے غش کر دیا ہے کہ اب اس راہ میں کسی کا گمراہ ہونا صرف اس کی بدقسمتی ہے۔'' پھر آگے فرماتے ہیں :

''پس کسی کیلئے جس طرح یہ درست نہیں ہے کہ وہ دین کے نظام عقائد یا نظام اعمال میں کچھ طبقوں کی غلط روی کی وجہ سے غیر مطمئن ہو کر عقائد واعمال کی فکر سے بے نیاز ہو جائے، اسی طرح کسی کیلئے یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ سلوک وتصوف میں کچھ لوگوں کی غلط روی کی وجہ سے دین کے اس شعبہ سے بے نیاز ہو جائے، جس کے بغیر بندہ کا دین کامل نہیں ہوتا اور حلاوت ایمان نصیب نہیں ہوتی''۔ (۱)

(۱) دین وشریعت : ۲۴۷

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی حقیقت اور غلط فہمیوں کا ازالہ

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود یہ تصوف کی دو اصطلاحیں ہیں، اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب سالک راہِ معرفت کو اختیار کرتا ہے تو دورانِ راہ مقاماتِ سلوک میں سے اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ بھی اس عالم میں موجود ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے اور تمام اشیاءِ کائنات ایک ہی وحدت سے وابستہ ہیں؛ جب یہ حالت غلبہ پالیتی ہے تو پھر سالک کی نظروں سے اشیاء کی کثرت غائب ہوجاتی ہے یہاں تک کہ خود اُس کا وجود بھی اُسے محسوس نہیں ہوتا، صرف ایک ذاتِ حق کے سوا دوسری ہر چیز اور اس کا اپنا وجود اُس کی نظروں میں کالعدم ہوجاتا ہے، اس کیفیت کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ:

کثرتِ اشیاء معدوم نہیں ہوتیں وہ سب اپنی جگہ موجود رہتی ہیں، البتہ سالک کو غلبۂ توحید کی وجہ سے ایک قسم کا ذہول ہوجاتا ہے کیونکہ اس کی توجہ ذاتِ حق کی طرف ہوتی ہے جیسے آسمان پر ستارے کہ آفتاب طلوع ہوتے ہی نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں، حالانکہ وہ اپنی جگہ موجود ہیں، اس کو "وحدۃ الشہود" کہتے ہیں۔ یعنی سوائے ذاتِ حق کے اور کچھ مشاہد نہیں ہوتا یہ ایک کیفیت ہے اور اس کو وہی شخص اچھی طرح جانتا ہے جس پر یہ کیفیت گذری ہو، یہ کوئی شریعت کا مسئلہ نہیں اور اکتسابی بھی نہیں۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی حقیقت اور اس کے صحیح مفہوم کو بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھتے ہیں:

گو ممکنات موجود ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو وجود دیا ہے، موجود کیوں نہ ہوتے مگر وجود حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص اور ضعیف وحقیر ہے، اس لئے وجودِ ممکن کو وجودِ حق کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے، جب یہ کالعدم ہوا تو وجود معتدبہ (حقیقی) ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی ہیں وحدۃ الوجود کے! کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے ایک ہونا وجود کا۔ سوا ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا گو ہے سہی مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں، مگر اسے ادعاءِ وحدۃ الوجود کہا جاتا ہے...... اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق علمی میں توحید کہتے ہیں، جس کی تحصیل

کوئی کمال نہیں اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں........... کہلاتا ہے۔ یہ البتہ مطلوب ومقصود ہے اور یہی حاصل ہے وحدۃ الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا ترجمہ ہے، ایک ہونا شہود کا کہ واقعہ میں تو ہستی متعدد ہیں، مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں، پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے "کما قال مرشدی" مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہوگئے تھے، اس لئے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا جو بہ نسبت پہلے عنوان کے مقصود پر زیادہ وضاحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے، دلیل نقلی اس مسئلہ کی یہ ہے کہ "كُلُّ شَيءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" (ہر چیز سوائے اس کی ذات کے معدوم ہے) جیسا کہ شارح عقائد نسفیؒ نے تفسیر کی ہے۔(۱)

حافظ ابن قیم اور حافظ تیمیہؒ جن کے حوالہ سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ دونوں تصوف کے بالکل مخالف ہیں، بہر صورت انھیں تصوف سے بیر ہے وہ وحدۃ الوجود کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں، حافظ ابن قیم جو کہ علامہ کے اخص الخواص شاگردوں میں سے ہیں اس مسئلہ کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جس طرح انوارِ مخلوق نورِ حق کے سامنے اور علم خلق علم حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت خدا کی قدرت کے سامنے مضمحل ہے، اسی طرح زمان؛ دہر اور وقتِ دوام الٰہی کے سامنے مضمحل ہے؛ لیکن جب سالکین پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے، قوتِ تمیز کمزور ہوجاتی ہے اور حال غالب ہوجاتا ہے تو اہلِ استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے "ما في الوجود الا الله، ما ثم موجود الحقيقة الا الله، هناك يفنى من لم يكن ويبقىٰ من لم يزل" بے شبہ وجودِ حق اور اُس کا دوام جب ماسویٰ پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے اور یہیں سے وحدۃ الوجود کے قائلوں کو غلط فہمی ہوگئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے اور اِس قسم کے مشتبہ کلمات کو (جو کہ اہل استقامت کے زبان سے نکل گئے) انہوں نے اپنے کفر کا سنگ بنیاد قرار دیا۔(۲)

(۱) شریعت وطریقت: ۳۱۰-۳۱۱ (۲) مدارج السالکین: ۸۶/۳

حافظ ابن قیمؒ کی وسعتِ خیال کا یہ عالم ہے کہ اگر سالک غلبۂ حال میں "سبحانی" یا "ما في الجبة الا اللّٰه" کہہ دے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق سمجھتے ہیں۔(۱)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ غیر حق عین ہوگیا، یا ذاتِ باری اشیاء کے اندر حلول کرگئی اور وہ بعینہٖ اُس کی ذات قرار پائی یا تمام موجودات ومشاہدات بعینہٖ ذاتِ باری کا پرتو ہیں، اس طرح کا اعتقاد تو بالکل کفر ہے، اس کا صحیح مطلب جیسا کہ بیان کیا گیا یہ ہے کہ جب سالک پر غلبہ توحید کا ہوتا ہے اور اس پر استغراق اور غلبۂ حال کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کیلئے باری تعالیٰ کے وجود کے سامنے ہر چیز حقیر، ناتواں کمزور بالکل عدم کے درجے میں نظر آنے لگتی ہے جیسا کہ ذاتِ باری کے مقابل میں کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے) اس طرح سے وہ یہ کہتا ہے کہ لا موجود الا اللّٰہ، صرف موجود اللہ کی ذات ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسری چیزیں حقیقۃً معدوم ہوگئیں بلکہ وہ سب اپنی جگہ موجود ہوتی ہیں، البتہ سالک غلبۂ توحید کی ذاتِ باری کی طرف توجہ کامل کی وجہ سے ان اشیاء کی طرف سے ذہول ہوجاتا ہے۔

ہمہ اوست کا مطلب

ہمہ اوست کے معنی ہیں سب کچھ وہی ہے، یہ بھی صوفیہ کا ایک قول ہے جو وحدۃ الوجود کی اس اصطلاح سے قریب تر مفہوم رکھتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو واقعی مقربین بارگاہِ الٰہی ہوتے ہیں جب ان پر محبتِ الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے تو اُن کی نظروں میں حق تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا سب پوشیدہ ہوجاتا ہے اور ہر جگہ ذاتِ حق کا ظہور نظر آتا ہے تو وہ کہہ اُٹھتے ہیں ہمہ اوست (سب کچھ وہی ہے) اور یہ اپنے اس قول میں حق اور درستگی پر ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اس لفظ کی حقیقت اور مراد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حدیثِ قدسی ارشاد باری ہے: "یوذینی ابن ادم یسب الدهر وانا الدهر" (۲) "ابن آدم مجھے آزردہ کرتا ہے کہ وہ زمانہ کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہو"۔

---

(۱) مدارج السالکین : ۱/۸۴، وطریق الهجرتین
(۲) ۹۲، بخاری : باب قول اللّٰه یریدون ان یبدلوا کلام اللّٰه، حدیث : ۷۰۵۳،
مسلم، باب النهی عن سبّ الدهر، حدیث: ۶۰۰۰

پھر اس کی آگے تفسیر ہے: بیدی الامر اقلب اللیل والنهار میرے ہی قبضہ میں سب کام ہیں (جو کہ زمانہ میں واقع ہوتے ہیں)۔

اِس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ زمانہ دونوں متحد ہیں دونوں کا وجود ایک ہی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ میں جو افعال وآثار ہیں وہ میرے قبضۂ قدرت میں، لہٰذا اس طرح حقیقی تصرف کرنے والے اور موجود مستقل خدا کی ذات ہوتی، ایسے ہی "ہمہ اوست" کا مطلب "سب کچھ وہی ہے" یعنی کل ممکنات تو موجود ظاہری ہیں اور حقیقت میں کوئی موجود حقیقی یعنی تمام اوصاف کا حامل نہیں ہے یہ ایسے ہی ہوا جیسے کوئی حاکم کسی مظلوم اور فریادی سے یوں کہہ، تم نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی؟ تم نے کسی وکیل سے مشورہ بھی کیا؟ اور وہ یوں کہے جناب وکیل اور پولیس سب آپ ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ حاکم اور پولیس اور وکیل سب ایک ہی ہیں ان میں کچھ فرق نہیں، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور وکیل کوئی چیز آپ کے سامنے قابل شمار نہیں، آپ اُن سب اختیارات کے حامل ہیں، اِسی طرح یہاں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمہ اوست کے یہ معنی نہیں ہیں "ہمہ" اور "او" ایک ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہمہ کی ہستی قابل اعتبار نہیں صرف "او" کی ہستی لائق شمار ہے اور باقی جتنے موجودات ہیں ہستی تو ان کی بھی واقعی ہے، مگر ان کی ہستی ہستیِ کامل کے سامنے ایک ظاہری ہستی ہے متقی یعنی کامل نہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ کامل کے روبرو ناقص ہمیشہ کالعدم (نہیں) شمار ہوتا ہے۔

اس لفظ کی حقیقت کو سمجھنے میں جو غلطی عموماً ہوتی ہے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانیؒ لکھتے ہیں:

> اس عبارت کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی جو حلول اور اتحاد سے دور ہے یعنی "یہ سب کچھ نہیں بس وہی موجود ہے" یہ مطلب نہیں کہ یہ بھی ہیں اور اس کے ساتھ متحد ہیں یہ بات تو کوئی بے وقوف بھی نہیں گا تو ان بزرگوں سے اس کا تصور کیسے ہوسکتا ہے، جب غلبۂ محبت میں محبوب کے سوا ہر چیز ان کی نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے اور اس ذات کے سوا کوئی ہستی ان کے شہود میں نہیں رہتی تو وہ کہہ دیتے ہیں "ہمہ اوست" یعنی سب کچھ وہی ہے یعنی یہ سب کچھ جو نظر آرہا ہے وہم اور خیال ہے اور موجود صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات ہے۔(۱)

---

(۱) آئینہ سلوک : ۱۱۵-۱۱۶

عینیت وغیریت

یہ دواصطلاحیں بھی مسئلہ وحدۃ الوجود کی بڑی اہم اصطلاحیں ہیں، عین کے معنی ہیں دو چیزوں کا ایک جیسا ہونا، صوفیۂ خالق اور مخلوق میں عینیت ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالی شانہ واجب الوجود کے سامنے کوئی اور وجود نہیں اور جو کچھ عالم میں نظر آرہا ہے وہ حق تعالی شانہ کے وجود سے کوئی الگ وجود نہیں رکھتا مخلوق چونکہ خالق کی صفتِ خلق کا مظہر ہے اور صفت موصوف سے جدا نہیں ہوسکتی، اس لئے مخلوق بھی خالق سے جدا نہیں، چنانچہ مولانا جامیؒ اس بات کو بیان کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں :

پس یہ کائنات حق تعالی شانہ کا ظاہر ہے اور حق تعالی شانہ اس کا باطن ہے' یہ کائنات ظہور سے پہلے عینِ حق تھی اور حق تعالی بعد ظہور عینِ کائنات ہے، حقیقت میں ہستی ایک ہے اور ظہور وبطون اور اول ہونا اور آخر ہونا محض اعتباری اور اضافی ہے جیسا کہ قرآن میں حق تعالی شانہ کا ارشاد ہے: "هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ" (۱) خالق اور مخلوق کی اس نسبتِ عینیت کو بعض گمراہ اور جہلاء نے لغوی اور حقیقی سمجھ کر خود گمراہ ہوئے اور ہزاروں کو گمراہ کیا۔ عبد ورب میں عینیت وغیریت دونوں موجود ہیں، وہ ایک وجہ سے اور یہ ایک وجہ سے مثلاً کوئی شخص اپنے اردگرد کئی آئینے رکھ لے تو ہر آئینے میں ذات وصفات اس کی بعینہٖ ظاہر ہوں گی، مثلاً خوشی، غم، ہنسنا، رونا وغیرہ بھی آئینہ کے عکس میں دکھائی دیں گے، اس سبب سے یہ کہہ سکتے ہیں، عکس اس شخص کا عین ہے، مگر یہ عینیت اصطلاحی اور اعتباری ہے لغوی نہیں، اگر لغوی ہوتی تو کیفیت عکس پر گذرتی وہی شخص پر گذرنا واجب ہوتا، لیکن عکس پر اگر پتھر مارا جائے یا کوئی نجاست ڈالی جائے تو شخص کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ وہ نجاست سے پلید ہوگا بلکہ وہ اپنے حال پر ان نقصانات سے بچا رہے گا تو اس طرح سے غیریت ہوئی، پس شخص اور عکس میں عینیت وغیریت دونوں پائی گئیں۔ اس طرح بندے اور رب میں عینیت' غیریت دونوں پائے جانا چاہئے، جو شخص عبد (بندہ) اور رب میں عینیتِ حقیقی کا اعتقاد رکھے اور غیریت کا انکار کردے وہ ملحد اور زندیق ہوگا کیونکہ اس عقیدہ سے عابد ومعبود، ساجد ومسجود کا کچھ فرق نہیں رہ جائے گا۔ (۲)

(۱) الحدید : ۳ (۲) آئینہ سلوک بحوالہ شمائم امدادیہ : ۱۱۵

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں مسئلہ وحدۃ الوجود کوئی شرکیہ اور کفریہ چیز نہیں ہوتی بلکہ حقیقی اور واقعی اور نفس الامری چیز ہوتی ہے، اس کا انکار محض وہ شخص کرسکتا ہے جو ضد اور انانیت پر اڑا ہو اور جو رائے کو پرت بنانا خوب جانتا ہو۔

غلط فہمی کی اصل وجہ

وحدۃ الوجود کے اس مسئلہ میں غلط فہمی کی اصل وجہ اس کے غالی مبلغین وداعی حضرات کا اس بارے میں ورع واحتیاط اور اس کے خاص تحقیقی مزاج ومذاق کو ملحوظ نہ رکھنا تھا، انہوں نے اس مسئلہ کی پوری تحقیق وجستجو کے بغیر محض خوش اعتقادی میں مبتلا ہوکر بزرگانِ دین اور توحید ومعرفت کے حقیقی شناور لوگوں نے اس بارے میں جو اعتبارات ملحوظ رکھتے تھے، اس کو پس پشت ڈال کر اس حوالے سے شریعت، عقل اور اخلاق ہر طرح کے حدود پھیلانگنے لگے تھے اور پورے معاشرہ کو اپنے غلط عقائد ونتائج کے نتیجے میں ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا کررکھا تھا، ان الفاظ کے صحیح منشا کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انہوں نے فتنہ کا ایک دروازہ کھول رکھا تھا، خود بھی گمراہ ہو رہے تھے اور عالم انسانیت کو گمراہی کا شکار کررہے تھے۔

انہوں نے بندے اور رب کے درمیان عینیت اعتباری واصطلاحی جس کا خیال بزرگان دین رکھا کرتے تھے اس کو چھوڑ کر بندے اور رب کے درمیان عینیت حقیقی اور لغوی کے قائل ہوگئے تھے جس سے بہت سارے مفاسد جنم لے رہے۔ رب اور بندے کا ایک ہونا لازم آرہا تھا اور چیزوں کو غیر حق نہیں بلکہ عین حق قرار دے رہے تھے اور اس کے آڑ میں بہت سے محرمات کا ارتکاب کررہے تھے اور شریعت سے منہ موڑ رہے تھے' جب ہر چیز وجود حق تعالی ہے تو پھر شریعت کی ضرورت کیسی؟، جب غیریت ختم ہوگئی اور عینیت ثابت ہوگئی اور حق' حق رہا تو حق کیلئے شریعت کی پابندی کیسی؟ اس طرح کی گمراہی وجود میں آگئی تھی، چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے اس مسئلہ کے غالی معتقدین کے کچھ اقوال بھی نقل کئے ہیں جس سے ان کی گمراہی کا اچھی طرح پتہ چلتا ہے :

''وہ لوگ شراب پیتے تھے اور محرکات کا ارتکاب کرتے تھے (کہ جب موجود ایک تو حلال وحرام کی کیا تفریق)''۔

ایک مرتبہ اس مسئلہ میں غلو کی حد تک تجاوز کرنے والوں کا گذر ایک مرتبہ کتے کے پاس سے ہوا، جس کو خارش تھی، ان میں سے ایک نے کہا: ''یہ بھی ذاتِ خداوندی ہے، اس نے

جواب دیا کہ کیا کوئی چیز اس کی ذات سے خارج ہے ہاں سب کے سب اسی کی ذات کے اندر ہے بعض لوگوں سے کہا گیا کہ جب وجود ایک ہے تو بیوی کیوں حلال اور ماں کیوں حرام ہے؟ اس محقق نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک سب ایک ہیں"۔(۱)

ابن عربی اور مسئلہ وحدۃ الوجود

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ۸۳۶ھ کو جو شیخ اکبر کے نام سے شہرۂ آفاق ہیں کو اس مسئلہ کے بانی اور موسس کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، جن کی تصانیف فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم اس بارے میں بہت مشہور ہیں، کیا یہ بھی اس مسئلہ میں ان کے غالی معتقدین کی طرح تشدد آمیز اور حدود شرع سے ہٹ کر اعتقاد رکھتے تھے یا یہ حق پرست اور توحید کے حقیقی شناور تھے۔

ان کے حوالہ سے علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

ابن عربی ان لوگوں میں سے (ان کے شاگردوں کے مقابلے میں) اسلام سے قریب تر ہیں، اور ان کا کلام بہت سے مقامات پر نسبتاً بہتر ہے، اس لئے کہ وہ مظاہر اور ظاہر میں فرق کرتے ہیں، امرونہی اور شرائع احکام کو اپنی جگہ رکھتے ہیں، مشائخ نے جن اخلاق وعبادات کی تاکید کی ہے، ان کے اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اس لئے بہت سے عابد وصوفی ان کے کلام سے سلوک کو اخذ کرتے ہیں، اگرچہ وہ ان کے حقائق کو اچھی طرح نہیں سمجھتے، ان میں سے جو ان حقائق کو سمجھتے ہیں اور ان کی موافقت کرتے ہیں، ان پر ان کے کلام کی حقیقت منکشف ہوجاتی ہے۔ (مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر المنجی مندرجہ جلاء العینین: ۵۷)۔(۲)

حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ اکبر کے بارے میں فرماتے ہیں:

یہ فقیر شیخ محی الدین کو مقبولین میں سمجھتا ہے، لیکن ان کے وہ علوم (جو جمہور کے عقائد اور کتاب وسنت کے ظواہر کے خلاف ہیں) ان کو خطا اور مضر سمجھتا ہے لوگوں نے ان کے بارے میں افراط وتفریط کی راہ اختیار کی ہے اور وہ میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں، ایک جماعت شیخ پر زبان طعن وملامت دراز کرتی ہے اور ان کے معارف وحقائق کی بھی تغلیط کرتی ہے، دوسری جماعت نے شیخ کی مکمل تقلید اختیار کی ہے اور ان کے تمام معارف وحقائق کو

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت : ۹۷/۴-۲۸۰ (۲) بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت : ۲۷۸/۴

برسرِ حق سمجھتی ہے اور دلائل وشواہد سے ان کی حقیقت ثابت کرتی ہے، اس میں شک نہیں کہ دونوں فریقوں نے افراط وتفریط سے کی راہ اختیار کی ہے اور میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں عجیب معاملہ ہے شیخ محی الدین مقبولین حق میں نظر آتے ہیں اور ان کے اکثر معارف وتحقیقات نے جو اہل حق کے خلاف ہیں خطا وناصواب نظر آتے ہیں۔(۱)

اکثر علماء نے شیخ ابن عربی کی ان شطحیات کو غلبۂ حال پر محمول کر کے انہیں معذور قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے بھی ان کی برأت پر مستقل ایک رسالہ بنام "تنبيه الغبی بتبرئة ابن عربی" لکھا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں :

شیخ ابن عربی کے بارے میں قولِ فیصل یہ ہے کہ ان کے ولی ہونے کا اعتقاد رکھا جائے، لیکن ان کی کتابوں کے مطالعہ کو ناجائز قرار دیا جائے کیونکہ خود انہوں نے فرمایا ہے کہ "ہم ایسے لوگ ہیں کہ ہماری کتابیں (مذاق ناشناس لوگوں کیلئے) دیکھنا ناجائز ہے۔ یحرم النظر الی کتبنا ...... اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے بعض ایسی اصطلاحات مقرر کر رکھی ہیں جن سے وہ ان کے معروف معنی کے سوا کچھ اور معنی مراد لیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کے الفاظ کو معروف معنی پہنائے گا تو وہ کافر ہوجائے گا۔ امام غزالیؒ نے بھی یہ بات اپنی بعض کتابوں میں لکھی ہے۔(۲)

شیخ ابن عربیؒ کے بارے میں یہ بڑا معتدل فیصلہ ہے، حضرت تھانویؒ نے بھی ان کی برأت میں ایک رسالہ لکھا ہے بنام "تنبيه الطربی فی تنزيه ابن العربی" اس میں بھی انہوں نے تقریباً یہی موقف اختیار کیا ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ شیخ اکبر کے بارے میں فرماتے ہیں:

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان بیباکانہ اقوال اور اباحیت وفوضویت (اخلاقی انارکی) کی ذمہ داری شیخ اکبر جیسے عارف ومحقق پر یا ان کی کتابوں پر عائد ہوتی ہے، جو بغایت درجہ متبع سنت، عابد، زاہد، مرتاض ومجاہد اور نفس سے شدید محاسبہ کرنے والے مکاید وشیطان اور غوائل نفس سے بدرجۂ اتم واقف تھے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ان کا رسالہ "روح القدس") لیکن ان کے

(۱) مکتوب ۲۶، ص ۱۲، بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت : ۲۹۲/۴-۲۹۵
(۲) شذرات الذهب لابن العماد : ۹۱/۵

یہاں اس طرح کے غریب اور موحش اقوال ملتے ہیں، جن سے رائے کا پرت بنالینے والوں کو مسالہ ہاتھ آتا ہے...... مثلاً یہ کہ "عہدِ موسوی کے گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی، ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برسرِ حق تھا "انا ربکم الاعلی" بلکہ وہ عین تھا، اس طرح کے دیگر اقوال ذکر کیے ہیں۔

حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں :

شیخ اکبر کے یہ سب اقوال الرد الأقوم علی مافی کتاب فصوص الحکم اور "الفرقان بین الحق والباطل" سے ماخوذ ہیں اور امام نے ان کو فصوص الحکم سے اقتباس کر کے لکھا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ شیخ اکبر کے علوم سے اشغال رکھنے والوں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ شیخ کی کتابوں بالخصوص "فصوص الحکم" میں کثرت سے الحاقات واضافات کئے گئے ہیں (اس لئے ان مسائل کی صحیح نسبت ابن عربیؒ کی طرف نہیں کی جاسکتی)۔(۱)

فضائلِ اعمال اور جاہل صوفیاء پر نکیر

صرف شیخ یا پیر کی دُعا پر عمل کے بغیر اعتماد کرنا نادانی ہے

حضرت شیخ زکریا صاحبؒ نے حکایاتِ صحابہ میں ابوداؤد کی یہ روایت نقل کی ہے: اس کے فائدے کے ذیل میں اعمال کی اہمیت کی طرف توجہ دلایا ہے اور ان لوگوں پر نکیر فرمائی ہے جو صرف پیر یا بزرگ کی دعاؤں پر تکیہ کئے رہتے ہیں اور بغیر عمل کے اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں انہیں اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے جس میں ان صحابیٔ رسول کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی مسواک وغیرہ رکھنے کی خدمت پر مامور تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے میری خدمات سے خوش ہو کر فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے؟ اُنہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ جنت میں آپ کی رفاقت، آپ ﷺ نے فرمایا اور کچھ کہ بس یہی چیز مطلوب ہے' آپ نے فرمایا: "اچھا میری مدد کیجیو سجدوں کی کثرت سے"۔

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت : ۲۸۱/۴-۲۸۲

فائدہ:- اس میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ صرف دعا پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھنا چاہئے، بلکہ کچھ طلب اور عمل کی بھی ضرورت ہے اور اعمال میں سب سے اہم نماز ہے کہ جتنی اس کی کثرت ہوگی اتنے ہی سجدے زیادہ ہوں گے، جو لوگ اس سہارے بیٹھے رہتے ہیں کہ فلاں بزرگ فلاں پیر سے دعا کرائیں گے' سخت غلطی ہے۔ اللہ جل شانہ نے اس دنیا کو اسباب کے ساتھ چلایا ہے اگرچہ بے اسباب ہر چیز پر قدرت ہے اور قدرت کے اظہار کے واسطے کبھی ایسا بھی کرتے ہیں، لیکن عام عادت یہی ہے کہ دنیا کے کاروبار اسباب سے لگا رکھے ہیں، حیرت ہے کہ ہم لوگ دنیا کے کاموں میں تو تقدیر پر اور صرف دُعا پر بھروسہ کر کے کبھی نہیں بیٹھتے، پچاس طرح کی کوشش کرتے ہیں، مگر دین کے کاموں میں تو تقدیر اور صرف دعا پر بھروسہ کرتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اللہ والوں کی دُعا نہایت اہم ہے مگر حضور ﷺ نے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ سجدوں کی کثرت سے میری مدد کرنا۔(۲)

جماعت کا اِہتمام وظائف ونوافل کی کثرت سے اہم ہے

حضرت شیخؒ نے باجماعت نماز کی اہمیت وفضیلت اور اس کے ترک پر مختلف وعیدوں کا ذکر کرنے کے بعد ان جاہل صوفیوں پر بھی تنبیہ فرمائی ہے کہ جن کے یہاں اوراد واذکار اور نوافل کی کثرت کا تو خوب اہتمام ہوتا ہے، لیکن جماعت کی نماز کی پرواہ نہیں کرتے۔ جہاں تک باجماعت نماز کی ادائیگی کا سوال ہے تو یہ امر واجب ہے، جس کا مقام ان اوراد ونوافل سے کہیں بلند تر ہے۔

چنانچہ شیخ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"جاہل صوفیہ میں وظیفوں اور نفلوں کا تو زور ہوتا ہے، مگر جماعت کی پرواہ نہیں ہوتی، اس کو وہ بزرگی سمجھتے ہیں حالانکہ کمال بزرگی اللہ کے محبوب کی اتباع ہے، ایک حدیث میں وارد ہے کہ تین شخصوں پر حق تعالیٰ شانہ لعنت بھیجتے ہیں، ایک اس شخص پر جس سے نمازی (کسی معقول وجہ سے) ناراض ہوں اور وہ امامت کرے، دوسرے اس عورت پر جس کا خاوند اس سے ناراض ہو' تیسرے اُس شخص پر جو اذان کی آواز سنے اور جماعت میں شریک نہ ہو۔(۲)

(۱) حکایاتِ صحابہ : ۴۳-۴۴ (۲) فضائلِ نماز : ۵۴-۵۵

غیر مسنون الفاظِ صلوٰۃ وسلام (جس میں دوسرے معنی کا وہم ہو) سے کراہت کا اظہار

دُرُودِ شریف نہایت ہی اہم اور بابرکت چیز ہے، اس سے انسان کے بے شمار گناہ معاف اور بے انتہاء درجے بلند ہوتے ہیں، اس لئے آیات واحادیث میں حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے، خود آنحضرت ﷺ کا اِس اُمت پر اس قدر بڑا احسان ہے کہ آپ پر درود بھیجنے میں بخل یا تامل سے کام لینا بڑی بے مروّتی اور احسان ناشناسی ہے، لیکن درود کے حوالہ سے اس بات کا بڑا اہتمام رہے کہ اِسی درود کو ورد میں رکھا جائے جو احادیث سے ثابت ہے، غیر مستند نامعتبر درود سے جس کی ایجاد غالی صوفیوں نے کی ہے اس سے بالکلیہ احتراز کیا جائے، جو اکثر وبیشتر کفریات وشرکیات یا کم از کم موہم شرک الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں، اسی غیر مستند اور غیر مسنون درود اور صلوۃ وسلام سے کراہت کا اظہار کرے۔

حضرت شیخؒ رقم طراز ہیں :

یقیناً اس شخص کے ظلم میں کیا تردد ہے جو نبی کریم ﷺ کے اتنے احسانات پر بھی نبی کریم ﷺ پر درود نہ پڑھے، حضرت گنگوہی کی سوانح عمری ''تذکرۃ الرشید'' میں لکھا ہے کہ حضرت عموماً متوسلین کو درود شریف پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے کہ کم از کم تین سو مرتبہ روزانہ پڑھا جائے اور اتنا نہ ہو سکے تو ایک تسبیح میں تو کمی نہ ہونی چاہئے، آپ فرمایا کرتے تھے جناب رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا احسان ہے، پھر آپ پر درود بھیجنے میں بھی بخل ہو تو بڑی بے مروّتی کی بات ہے، درود شریف میں زیادہ تر وہ پسند تھا جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ الفاظ صلوۃ وسلام جو احادیث میں منقول ہیں، باقی دوسروں کے مولفہ درود تاج لکھی درود عموماً آپ کو نہ پسند تھے، بلکہ بعض الفاظ کو دوسرے معنی کا موہم ہونے کے سبب خلافِ شرع فرماتے تھے۔(۱)

---

(۱) فضائل درود : ۷۲

کسی ایک نیکی پر مغفرت ہوجانے کے واقعات سے مغالطہ میں نہ پڑنے کی تنبیہ

فضائل اعمال میں حضرت شیخ صاحبؒ نے بے شمار واقعات خصوصاً فضائل درود شریف میں ایسے لکھے ہیں جس میں کسی ایک نیکی پر مغفرت ہوجانے کا ذکر ہے، محض کسی ایک نیکی سے مغفرت اور بخشش کے بارے میں مغالطہ میں نہ پڑنے اور اس کو مشکل اور مستبعد نہ سمجھنے پر تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں اور اوّلاً اِس بارے میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں :

علامہ سخاویؒ بعض تواریخ سے نقل کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بہت گنہگار تھا۔ جب وہ مرگیا تو لوگوں نے اس کو ویسے ہی زمین پر پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اس کو غسل دے کر اس پر جنازہ کی نماز پڑھیں میں نے اس کی مغفرت کردی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ یہ کیسے ہوگیا؟۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ اس نے ایک دفعہ توراۃ کھولا تھا، اس میں محمد ﷺ کا نام دیکھا تھا تو اس نے ان پر درود پڑھا تھا تو میں نے اس کی وجہ سے اس کی مغفرت کردی۔ (القول البدیع)

اس طرح کے متعدد واقعات لکھنے کے حضرت شیخ فرماتے ہیں :

''اس قسم کے واقعات میں کوئی اشکال نہیں، نہ تو ان کا یہ مطلب ہے کہ ایک دفعہ درود شریف پڑھ لینے سے سارے گناہ کبیرہ اور حقوق العباد سب معاف ہوجاتے ہیں اور نہ اس قسم کے واقعات میں کوئی مبالغہ یا جھوٹ وغیرہ ہے یہ مالک کے قبول کر لینے پر ہے، وہ کسی شخص کی معمولی سی عبادت، ایک دفعہ کا کلمہ طیبہ قبول کرلے جیسا کہ فصل اول کی حدیث ۱۴ میں ''حدیث البطاقہ'' (جس میں یہ ذکر ہے کہ ایک شخص کے ننانوے دفتر گناہ کے ہوں گے جو حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ہوں گے، اس کو اپنے کئے کی سزا کا یقین ہوجائے گا، پھر اللہ عزوجل کی طرف یہ ارشاد ہوگا کہ آج تجھ پر کسی طرح کا ظلم نہ ہوگا، پھر ایک کلمہ والا پرزہ نکالا جائے گا اور اُسے ان ننانوے گناہوں کے دفتروں کے مقابلہ میں تولا جائے گا اس کے اس کلمہ کو ایک مرتبہ اخلاص کے ساتھ کہنے کی وجہ سے وہ پرزا بھاری ہوجائے گا اور اس کی مغفرت کردی جائے گی) رواہ الترمذی وقال حسن غریب، وابن ماجہ،

وابن حبان في صحيحه والبيهقي والحاكم وقال صحيح على شرط مسلم میں گذر چکا ہے کہ اُس کی برکت سے اُس کے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک میں ارشاد ہے : اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ''بیشک اللہ تعالیٰ اس کی تو مغفرت نہیں فرماتے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے (یعنی مشرک وکافر کی تو مغفرت نہیں) اس کے علاوہ جس کو چاہیں گے بخش دیں گے'' اس لئے ان قصوں میں اور اس قسم کے دوسرے قصوں میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کو کسی کا ایک دفعہ کا درود پڑھنا پسند آجائے، وہ اس کی وجہ سے سارے گناہ معاف کردے با اختیار ہے' ایک شخص کے کسی کے ذمہ ہزاروں روپے قرض ہیں، وہ قرض دار کی کسی بات پر جو قرض دینے والے کو پسند آگئی ہو یا بغیر ہی کسی بات کے اپنا سارا قرضہ معاف کردے تو کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے، اسی طرح اللہ جل شانہ اگر کسی کو محض اپنے لطف وکرم سے بخش دے تو اس میں کیا اشکال ہے۔

فضائلِ حج میں ذکر کردہ واقعات عشقِ الٰہی پر مبنی ہیں

اس دولت سے تہی دامن کو نہ اِن واقعات سے اِستدلال کرنا چاہئے اور نہ اعتراض۔

حضرت شیخؒ نے فضائل حج میں عشق ووارفتگی، محبت ودلسوزی توکل واعتماد علی اللہ کے بے شمار واقعات ذکر کئے ہیں، عموماً اس قسم کے واقعات کو اس کے نہایت دشوار اور عقلاً غیر ممکن الوقوع ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کیا جاتا ہے، حضرت شیخؒ نے عشق الٰہی پر مبنی ان بے شمار واقعات کا ذکر کیا ہے ان واقعات کی تعداد ستر کے قریب ہے اور آخیر میں یہ فرمایا ہے کہ جو اس کوچے کی حقیقت سے واقف اور عشق خداوندی کی لذت سے بہریاب ہوتے ہیں ان سے ان واقعات کا پیش آنا کوئی محال نہیں ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں:

اوّل یہ کہ یہ احوال وواقعات جو گذرے ہیں وہ عشق الٰہی اور محبت پر مبنی ہیں اور عشق کے قوانین عام قوانین سے بالاتر ہیں:

مکتبِ عشق کے انداز نرالے دیکھے — اُس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

عشق کے ضوابط کسی اُصول کے ماتحت ہوتے ہیں نہ یہ پڑھنے لکھنے سے آتے ہیں بلکہ عشق پیدا کرنے سے آتے ہیں۔

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی

اپنا کام کوشش اور سعی کر کے اس سمندر میں کود پڑنا ہے، اس کے بعد ہر محنت آسان ہے اور ہر مشقت لذیذ ہے، ہر وہ چیز جو عشق سے بے بہرہ ہے لوگوں کیلئے مصیبت اور ہلاکت ہے، وہ اس سمندر کے غوطہ لگانے والوں کیلئے آسان اور لطف وفرحت کی چیز ہے اس سمندر میں غوطہ لگانے والے انجام اور عواقب کی مصلحت بینیوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔

عبث ہے جستجو بحرِ ظلمت کے کنارہ کی — بس اس میں ڈوب ہی جانا ہے اے دل پار ہوجانا

لہٰذا ان واقعات کو اسی عینک سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور اس رنگ میں رنگنے جانے کی کوشش کرنا چاہئے، لیکن جب تک عشق پیدا نہ ہو اس وقت تک نہ تو ان واقعات سے استدلال کرنا چاہئے اور نہ ان پر اعتراض کرنا چاہئے، اس لئے کہ وہ عشق کے منجملہ میں صادر ہوتے ہیں، امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص محبت کا پیالہ پی لیتا ہے وہ مخمور ہوجاتا ہے اور جو مخمور ہوتا ہے اس کے کلام میں بھی وسعت آجاتی ہے اگر اس کا وہ نشہ زائل ہوجائے تو وہ دیکھے کہ جو کچھ اس نے غلبہ میں کیا ہے وہ ایک حال ہے حقیقت نہیں اور عشاق کے کلام سے لذت تو حاصل کی جاتی ہے' اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ احیاء العلوم: ۳۔ (۱)

توکل کی حقیقت اور اُس کے مراتب اور اولیاء کے اسباب نہ اختیار کرنے کے واقعات کا صحیح مصداق

حضرت شیخ صاحبؒ کے ان واقعات کے ایک دوسرے پہلو یعنی اِن بزرگان دین کے توکل اللہ پر اعتماد اور اس پر کامل بھروسہ کے تعلق سے جو واقعات گذرے ہیں اُس سے توکل کی حقیقت، اس کے مراتب اور اولیاء کے اسباب نہ اختیار کرنے کے واقعات کا صحیح مصداق بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان واقعات کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان میں توکل کی وہ مثالیں گذری ہیں جو ہم جیسے

(۱) فضائل حج : ۲۸۸

نااہلوں کے عمل میں تو درکنار ذہنوں سے بھی بالاتر ہیں۔ اِن کے متعلق یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ توکل کا منتہا ہی یہی ہے جو اِن واقعات سے ظاہر ہوتا ہے اور پسندیدہ ہے اور اس کے کمال پر پہنچنے کی سعی اور کم سے کم تمنا تو ہونا ہی چاہئے، لیکن جب تک یہ درجہ حاصل نہ ہو اس وقت تک ترک اسباب نہ کرنا چاہئے''۔

ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے اور اگر کوئی شخص خالص توکل کا ارادہ کرے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ مستقیم الحال ہو اسباب چھوڑ کر پریشان نہ ہو، بلکہ اللہ جل شانہ کے سوا کسی دوسرے کا خیال بھی اس کو نہ آوے اور جن حضرات نے ترکِ اسباب کی مذمت فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کا حق ادا نہیں کرتے، بلکہ دوسرے لوگوں کے توشہ دانوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ (مرقاۃ: ۳۰)

حضورِ اکرم ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ اگر تم اللہ جل شانہ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو تم کو ایسی طرح رزق عطا فرمائے جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے جو اللہ کی طرف بالکلیہ منقطع ہو جائے تو حق تعالیٰ شانہ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور اسے ایسی طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا، ایک اور حدیث میں ہے جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ مستغنی ہو وہ ایسا بن جائے کہ اس کو اللہ جل شانہ کی عطاء پر اس سے زیادہ بھروسہ ہو جتنا اس مال پر ہوتا ہے جو اپنے پاس موجود ہے۔ (احیاء)

اس کا اندازہ ان دو قصوں سے ہوتا ہے جو احادیث میں مشہور ہیں۔ ایک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشہور قصہ کہ جب غزوۂ تبوک کیلئے چندہ کیا گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کچھ گھر میں تھا سب کچھ لے آئے اور جب حضورِ اکرم ﷺ نے دریافت کیا تو فرمایا کہ گھر میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک سونے کی ڈلی انڈے کے برابر پیش کی اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے ایک معدن سے مل گئی ہے،

اُس کو اللہ کے راستے میں دیتا ہوں، اِس کے سوا میرے پاس کوئی چیز نہیں، حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا۔ ان صاحب نے دوسری اور تیسری مرتبہ اسی طرح اصرار سے پیش کیا، حضورِ اکرم ﷺ نے اس کو لے کر ایسے زور سے پھینکا کہ اگر ان کے لگ جاتی تو زخمی کر دیتی اور یہ ارشاد فرمایا: کہ بعض آدمی اپنا سارا مال صدقہ کر دیتے ہیں، پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے واسطے بیٹھ جاتے ہیں۔ (ابوداؤد)

ان صاحب کا اعتماد علی اللہ اور توکل حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلے کیا ہو سکتا تھا، اس واسطے وہاں سب کچھ قبول فرما لیا اور یہاں ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ توکل کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ تو ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی مقدمہ میں کسی ہوشیار ماہر تجربہ کار کو وکیل بنالے کہ وہ ہر چیز میں اس وکیل کی طرف رجوع کرتا ہے، لیکن اس کا یہ توکل فانی ہے، کیسی ہے اس کو اپنے توکل کا شعور اور احساس ہے۔ دوسرا درجہ جو پہلے سے اعلیٰ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ ناسمجھ بچہ کا اپنی ماں کی طرف کہ وہ ہر بات میں اسی کو پکارتا ہے اور جب کوئی گھبراہٹ یا تکلیف کی بات اس کو پیش آتی ہے تو سب سے پہلے اس کے منہ سے اماں نکلتا ہے، ان ہی دونوں کی طرف حضرت سہیل نے اشارہ کیا ہے جبکہ ان سے کسی نے پوچھا کہ توکل کا ادنیٰ درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ امیدوں کا ختم کر دینا، پھر سائل نے پوچھا کہ درمیانی درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اختیار کا چھوڑ دینا پھر سائل نے پوچھا کہ اعلیٰ درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کو وہ پہچان سکتا ہے جو دوسرے درجہ پر پہنچ جائے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تیسرا درجہ جو سب سے اعلیٰ ہے وہ یہ کہ اللہ جل شانہ کے ساتھ ایسا ہو جائے جیسا کہ مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں کہ اس کی اپنی کوئی حرکت رہتی ہی نہیں، اسی درجہ پر پہنچ کر اللہ جل شانہ سے مانگنے کا بھی محتاج نہیں رہتا وہ خود ہی بلا طلب اس کی ضرورت کا تکفل کرتا ہے، جیسا کہ نہلانے والا خود ہی میت کی ضروریاتِ غسل کو پورا کرتا ہے۔

اس پر یہ اشکال کہ ''حضورِ اقدس ﷺ کا عام طریقہ اسباب کے اختیار کا تھا صحیح ہے، لیکن حق یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے شان یا شان وہی حالت تھی جس کو حضور ﷺ نے اختیار فرمایا، اگر حضورِ اقدس ﷺ کے حالات ان واقعات کی نوعیت کے ہوتے تو امت

بڑے سخت ابتلاء میں پڑ جاتی۔ حضور اقدس ﷺ کو امت پر شفقت کی وجہ سے اس کا بہت اہتمام تھا کہ ایسی چیز اختیار نہ فرمائیں جس میں امت کو مشقت ہو۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ چاشت کی نماز نہ پڑھتے تھے اور میں پڑھتی ہوں، بیشک حضور اقدس ﷺ بعض عمل باوجودیکہ حضور ﷺ کی خواہش اس کے کرنے کی ہوتی تھی، اس خوف سے چھوڑ دیتے تھے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔ (ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد کا مطلب کہ حضور ﷺ نہیں پڑھتے تھے اور میں پڑھتی ہوں اہتمام اور دوام ہے کہ جس شدت اہتمام سے حضرت عائشہؓ پڑھتی تھیں حضور ﷺ اتنے اہتمام سے نہ پڑھتے تھے ورنہ بیسوں روایات میں حضور کا چاشت کی نماز پڑھنا وارد ہوا ہے اور یقیناً حضور اقدس ﷺ روحی خداہ وابی وامی اگر اتنے شدت اہتمام سے پڑھتے تو یہی چیز اس کو واجب بنا دیتی۔ تراویح کے حوالہ سے بھی یہی بات ہوئی۔ آپ نے چند رات پڑھیں، پھر جب صحابہ رضی اللہ عنہم کے شدتِ اہتمام اور اشتیاق کو دیکھا تو فرضیت کے اندیشے سے دوبارہ ادا نہیں فرمائی۔

صاحبِ روض لکھتے ہیں:

جب منفعت (نفع حاصل کرنا) اور دفع مضرت (نقصان کو ختم کرنا) کے اسباب کا اختیار کرنا ہی طریقۂ جمہور انبیاء اور جمہور اولیاء کا ہے، لیکن اس سے ان اولیاء کرام پر جو مضرتوں سے نہ بچے تھے اور اپنے لئے اسباب نہ اختیار کرتے تھے اعتراض نہیں ہو سکتا، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ شریعتِ مطہرہ پر چلانے والے تھے، اس لئے ایسے سہل راستہ پر چلاتے تھے جس پر عوام وخواص سب چل سکیں اور اگر قافلوں کا چلانے والا کسی ایسے مشکل راستہ پر قافلہ کو لے جائیں جس پر وہ خود تو روانی وقوت سے چل سکتا ہو لیکن قافلہ کی اکثریت اس راستہ کی متحمل نہ ہو تو وہ قافلہ والوں کے اوپر مہربان شمار نہ ہوگا اور حضورِ اقدس ﷺ کی عالی شان خود حق سبحانہٗ وتقدس نے بتائی: عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبۃ:۱۶) پوری آیت شریفہ کا ترجمہ اور مطلب یہ ہے: ”(اے لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری

مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے۔ تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ بات تو سب کے ساتھ ہے، پھر بالخصوص) مؤمنین کے ساتھ تو بڑے شفیق اور مہربان ہیں“۔

پس اگر قافلہ کے قوی لوگ کسی مصلحت سے سخت راستہ کو اختیار کر لیں تو قافلہ کا لے جانے والا ان کو نہ روکے گا۔ (روض)

یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ اماموں کو طویل نماز پڑھانے پر نہایت شدت سے ڈانٹتے تھے اور یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جو امام ہے وہ ضرور ہلکی نماز پڑھے اور جو اپنی تنہا نماز پڑھے وہ جتنی چاہے لمبی نماز پڑھے۔

پھر آگے فرماتے ہیں:

بعض اوقات واقعات میں ایسی شدت ملتی ہے جو سرسری نظر میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور بظاہر یہ ناجائز معلوم ہوتا ہے اس کے متعلق یہ بات ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ یہ واقعات بمنزلہ دوا کے ہیں اور دوا میں طبیب صادق بسا اوقات سنکھیا بھی استعمال کرایا کرتا ہے، لیکن اس کا استعمال طبیب کی رائے کے موافق ہو تو مناسب ہے بلکہ بسا اوقات ضروری، لیکن بدون اس کے مشورہ کے ناجائز اور موجب ہلاکت، اسی طرح ان واقعات میں جن حاذق طبیبوں نے ان دواؤں کا استعمال کیا ہے ان پر اعتراض اپنی نادانی اور فن سے ناواقفیت پر مبنی ہے، لیکن جو خود طبیب نہ ہو اور کسی طبیب کا اس کو مشورہ حاصل نہ ہو، اس کو ایسے اُمور جو شریعتِ مطہرہ کے خلاف معلوم ہوتے ہوں اختیار کرنا جائز نہیں ہیں، البتہ فن کے ائمہ پر قواعد سے واقف لوگوں پر اعتراض میں جلدی کرنا بالخصوص ایسے لوگوں کی طرف جو خود واقفیت نہ رکھتے ہوں غلط چیز ہے اور ہلاکت میں اپنے آپ کو ڈالنا ہر حال میں جائز نہیں ہے، اگر دینی مصلحت اُس کی متقاضی ہو تو پھر مباح سے بھی آگے بڑھا جاتا ہے۔ (۱)

***

فہرستِ مراجع

ذیل میں ان کتابوں کے اسماء کو لکھ دیا جا رہا ہے۔ جن سے بلاواسطہ یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا۔

تفسیر و قرآنیات

احکام القرآن	ابوبکر حصاص رازیؒ
بیضاوی	قاضی ناصر الدینؒ
التفسیر المنیر	دکتور وهبه زهیلی
تفسیر ابن کثیر	علامه ابن کثیرؒ
تفسیر کبیر	علامه فخر الدین رازیؒ
تفسیر مظهری	علامه ثناء اللّٰه پانی پتیؒ
تفسیر طبری	محمد بن جریر طبریؒ
الدر المنثور	جلال الدین سیوطیؒ
روح المعانی	علامه محمود آلوسیؒ
برهان فی علوم القرآن	بدر الدین زر کشیؒ
احکام القرآن	محمد ابن ادریس الشافعیؒ
بیان القرآن	مولانا اشرف علی تهانویؒ
تفسیر عثمانی	علامه شبیر احمد عثمانیؒ

حدیث وشروحات

صحیح بخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ
صحیح مسلم	امام مسلم بن حجاج قشیریؒ
سنن ترمذی	امام محمد بن عیسٰی ترمذیؒ
سنن ابو داؤد	امام سلیمان بن اشعثؒ
سنن نسائی	امام احمد بن شعیب نسائیؒ
سنن ابن ماجه	امام محمد بن یزید الربعیؒ
مؤطا مالك	امام انس بن مالك
مؤطا محمد	امام محمد بن حسن الشیبانیؒ
سنن بیهقی	امام احمد بن حسین بیهقیؒ
سنن دارمی	امام عبد اللّٰه بن عبد الرحمن تیمیؒ

مستدرك حاکم	محمد بن عبد اللّٰه نیشاپوریؒ
مسند احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبلؒ
مشکوۃ المصابیح	محمد بن عبد اللّٰه خطیبؒ
مصنف ابن ابی شیبه	ابوبکر محمد بن ابی شیبهؒ
مصنف عبد الرزاق	عبد الرزاق صغانیؒ
کنز العمال	علاء الدین متقی هندیؒ
طبرانی(صغیر، کبیر)	سلیمان بن احمد طبرانیؒ
دارِ قطنی	علی بن عمر دار قطنیؒ
مجمع الزوائد	ابوبکر الهیثمیؒ
شرح الاذکار	محمد بن شرف نوویؒ
الادب المفرد	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ
مسند بزار	....
الجامع الصغیر	علامه جلال الدین سیوطیؒ
الترغیب و الترهیب	عبد العظیم بن عبد القویؒ
شرح السنة	علامه جلال الدین سیوطیؒ
فتح المغیث	محمد بن عبد الرحمنؒ
عارضة الاحوذی	حافظ ابن عربیؒ
عیون الاثر	ابن سید الناسؒ
المتفق والمفترق	خطیبِ بغدادیؒ
صحیح ابن حبان	ابن حبانؒ
الاجوبة الفاضلة	شیخ ابو فتح ابو غدةؒ
المغنی عن حمل الاسفار	عبد الرحیم حسینی عراقیؒ
شرح المناوی	علامه مناویؒ
جامع الاصول	علامه ابن اثیرؒ
حصن حصین	امام الجزائریؒ
فیض القدیر	علامه مناویؒ
جمع الوسائل	ملا علی قاریؒ
کتاب الروح	علامه ابن قیمؒ

الكفاية	خطیبِ بغدادیؒ
فتح الباری	احمد بن علی بن حجر عسقلانیؒ
اوجز المسالك	شیخ الحدیث زکریاؒ
بذل المجهود	مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
المنهاج	یحیٰی بن شرف نووی
فیض الباری	علامہ انور شاہ کشمیریؒ
فتح الملهم مع تکمله	علامہ شبیر عثمانیؒ، مولانا تقی عثمانی
قواعد التحدیث	علامہ جمال الدین قاسمی
التعلیق الممجد	عبد الحیٔ لکھنویؒ
معارف الحدیث	مولانا منظور نعمانیؒ
منتخب احادیث	مولانا یوسف صاحبؒ

فقہ، سوانح وتاریخ

بداية المجتهد	ابن رشد مالکیؒ
رد المحتار	ابن عابدین شامیؒ
البحر الرائق	ابن نجیم مصریؒ
کتاب الاصل	محمد ابن الحسن شیبانیؒ
البداية والنهاية	ابن کثیرؒ
الاصابة	ابن حجرؒ
الاستیعاب	ابن عبد البرؒ
المغنی	احمد بن محمد قدامہ مقدسیؒ
فتح القدیر	علامہ ابن ہمامؒ
رسائل ابن عابدین	علامہ عابدین شامیؒ
الحاوی للفتاویٰ	علامہ جلال الدین سیوطیؒ
اعلام الموقعین	علامہ ابن قیمؒ
طبقات ابن سعد	ابن سعدؒ
حلية الاولياء	علامہ ابو نعیمؒ
شرح السیر الکبیر	امام سرخسیؒ
زاد المعاد	علامہ ابن قیمؒ

مؤلفاتِ نجدی	محمد بن عبد الوهاب نجدیؒ
رحمة الله الواسعة	مفتی سعید احمد پالن پوری
حیاة الصحابه	مولانا محمد یوسف صاحبؒ
الفتاویٰ الحدیثیه	ابن حجر الهیثمی
دار العلوم دیوبند بمدرسة توجیهیة	عبید الله الاسعدی
أولیس فی سبیل الله الا من قتل	رفیق امجد قاسمی

اردو کتب ورسائل

انفاس العارفین	مجدد الف ثانیؒ
مکتوبِ امام ربانیؒ	مجددِ الف ثانیؒ
تفہیماتِ الٰہیہ	شاہ ولی اللہؒ
صراطِ مستقیم	شاہ اسماعیل شہیدؒ
فتاویٰ رشیدیہ	مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ
شریعت وطریقت	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ
مسائل تصوف	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ
التشرف	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ
نشر الطیب	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ
الاعتدال ''اسلامی سیاست''	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ
تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ
شریعت وطریقت کا تلازم	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ
كفاية المفتی	مفتی کفایت اللہ صاحبؒ
دینی دعوت	مولانا ابو الحسن علی ندویؒ
تزکیہ واحسان	مولانا ابو الحسن علی ندویؒ
تاریخ دعوت وعزیمت	مولانا ابو الحسن علی ندویؒ
فتاویٰ رحیمیہ	مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ
فتاویٰ حقانیہ	مولانا عبد الحق صاحبؒ
تسکین الصدور	سرفراز خان صفدر صاحبؒ
ازالة الریب	سرفراز خان صفدر صاحبؒ
الکلام المفید	سرفراز خان صفدر صاحبؒ

طائفہ منصورہ	سرفراز خان صفدر صاحبؒ
تجدید تعلیم و تبلیغ	مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ
ملفوظات مولانا محمد الیاس	مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ
تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات	مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ
دین و شریعت	مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ
تصوف کیا ہے؟	مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ
تصوف ایک تعارف	مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ
آئینۂ سلوک	حضرت نثار احمد خان صاحبؒ
حضرت تھانویؒ کے سیاسی افکار	مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
ایک عالمی و بین الاقوامی کتاب	مفتی شاہد صاحب مدظلہ
فہرستِ تالیفاتِ شیخ	مفتی شاہد صاحب مدظلہ
دعوت کی بصیرت	مفتی شاہد صاحب مدظلہ
ذکرِ زکریا	فیروز اعظمی
دعوتِ دین، مسائل کا حل	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ
طالبات کی دینی و عصری درسگاہیں	مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی
تبلیغ کا شرعی مقام	احمد نور محمد قادری صاحب
فضائل اعمال پر اعتراضات کے جوابات	مفتی عبدالکریم صاحب
مجموعہ رسائل غیر مقلدیت	جمعیۃ علماءِ ہند
محاضرات ردِّ رضاخانیت	مفتی امین صاحب
تبلیغ بالیقین کارِ نبوت ہے	فرید بک ڈپو
تصحیح الخیال ترجمہ تحقیق المقال	مولانا عبداللطیف بہرائچی مدظلہ
ملفوظات مولانا یوسف صاحبؒ	مفتی روشن صاحب
اکابر کا سلوک و احسان	مولانا زکریا صاحبؒ
عقائد الاسلام	مولانا ادریس کاندھلویؒ
ارشادات و مکتوبات، مولانا الیاسؒ	مولانا افتخار فریدی
آپ بیتی	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ

***

اپنے باتوفیق ناظرین سے التجاء ہے کہ اگر وہ اہلِ علم میں سے نہ ہوں تو خلوِ ذہن، سلامتِ فہم اور طلبِ صادق کے جذبہ کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ اپنے اہلِ حق معتمد علماء کی نگرانی میں اِس کتاب کا مطالعہ کریں اور اہلِ علم سے ایک دردمندانہ التماس ہے کہ دعوت کا کام صرف کتابوں سے پورا نہیں سمجھا جاسکتا، دعوت کی حقیقت، قرآن وحدیث اسلافِ امت کے عمیق علم، نہایت وسیع تجربات اور غیر معمولی محتاط وحساس مصالح پر مبنی اُصول کا سمجھنا بقدرِ علمی شرکت ہوگا، مجاہدہ کے بغیر حقائق کا اِدراک مشکل ہے اس لئے مسجد بنگلہ والی حضرت نظام الدینؒ اور اپنے اپنے مراکز میں حاضری اور کام کو اس کے سرچشمہ سے حاصل کرنا ضروری ہے۔ سیرت وحیاتِ صحابہ کی روشنی میں ضروریاتِ زمانہ، تقاضائے وقت کے اعتبار سے وہاں کے بتائے جانے والے اُصول ہی معیار ہیں۔



مکتبۃ الاتّحاد
MAKTABATUL ITTIHAD
Deoband -247554 Distt. Saharanpur (U.P.) India
Cell: 91-9897296985
e-mail : maktabatul_ittihad@yahoo.com

pentone
989 786 9314